حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

دسمبر 2018ء

-/30روپے

UGC’S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس اے شکور اسپیشل آفیسر تلنگانہ اسٹیٹ حج کمیٹی، حج 2019ء کے سلسلہ میں حج ہاؤز میں منعقدہ اجلاس میں اضلاع کے حج سوسائٹیوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ اسٹیٹ حج کمیٹی و دیگر عہدیداران وارکان دیکھے جاسکتے ہیں

شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے باہمی اشتراک سے منعقدہ ایک روزہ قومی سمینار
''رضیہ سجاد ظہیر: فکروفن'' کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر بیگ احساس بحیثیت مہمان اعزازی تقریر کرتے ہوئے۔
(دائیں سے بائیں): پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر علی احمد فاطمی (مہمانِ خصوصی)، ڈاکٹر اسلم پرویز، وائس چانسلر،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (صدرِ جلسہ) محترمہ نسیمہ تراب الحسن اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی

بنیاد گذار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۱۲ ماہ: دسمبر سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ **قیمت: 30/-**

❁ ہندوستان: 300 روپے

❁ کتب خانوں سے: 400 روپے

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے

❁ مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .500 082 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور نے طاؔ پرنٹ سسٹمس بلکڑی کاپل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کر رہی ہیں۔

آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔

آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا من پسند اور آزمودہ نسخہ

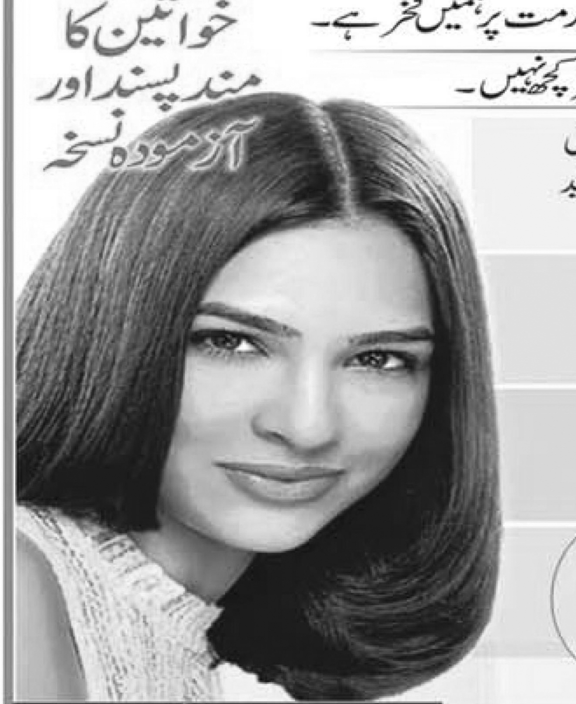

زم زم بہار ہیئر آئیل

• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد و دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم

- چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
- جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
- چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم

• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر

دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

®

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS

Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES

Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.

Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

انتخابات کے حربے	بیگ احساس	6

افسانے

مولانا گاؤدی	گلزار جاوید	8
عشرتِ قطرہ ہے	عارف خورشید	18
غشی	مشتاق احمد وانی	21

خاکہ

وضع داری اور قدامت پسندی	شاہد حسین زبیری	25

مضامین

بنارس والی گلی	نور الحسنین	28
قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''سیتا ہرن'': ایک تنقیدی جائزہ	فیروز عالم	35
عربی میں آزاد شاعری کا موجد کون؟	شمس کمال انجم	44
بیدی کے افسانوں میں عورت	گلشن آرا	48
آزادی کے بعد مغربی بنگال کے ادب پر تحریکات کا اثر	عبدالحلیم انصاری	53

خصوصی مضمون

نسائی ادب کی توانا آواز۔ فہمیدہ ریاض	محبوب خان اصغر	59

شاعری

مصطفیٰ شہاب، عابد علی عابد، مسعود جعفری، بی ایس جین جوہر	سیما شکور، بدر محمدی، نبیل احمد نبیل، رفیق جعفر مصداق اعظمی، محبوب خان اصغر	63

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر	سعیدہ بانو احمد	73

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	استوتی اگروال، منزہ شیخ، ثنا خاں، آئرہ فاطمہ حسان علی خاں، محمد عبدالغنی، وسیم بیگم	78

اداریہ

انتخابات کے حربے...!

چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش، میزورم، راجستھان اور تلنگانہ میں انتخابات ہو چکے ہیں اور رسالہ شائع ہونے تک نتائج بھی آجائیں گے۔ یہ نتائج کا 2019ء میں ہونے والے لوک سبھا کے الیکشن پر اثر انداز ہوں گے اور اس کے بعد مختلف پارٹیاں کیا حکمت عملی اختیار کریں گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن الیکشن کا ماحول تیار کیا جا رہا ہے۔ اس کی شروعات ہو چکی ہے۔ رام مندر کی تعمیر کے مسئلے پر شیوسینا میدان میں کود پڑی ہے جس کا اثر صرف مہاراشٹرا تک محدود ہے۔ جو اجتماع ایودھیا میں ہوا اس میں صرف تاریخ طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شاید جتنی بھیڑ کی امید تھی وہ اکٹھا نہیں ہو پائی اور معاملات توقع کے مطابق پورے نہیں ہوئے۔ اس لیے اسے آگے کے لیے ٹال دیا گیا۔ اسمبلی انتخابات میں خاص طور پر تلنگانہ میں بی جے پی کے سرکردہ لیڈروں نے جس لہجے میں تقریریں کی ہیں اس سے ان کے عزائم کا پتہ چلتا ہے۔ ادھر یوگی آدتیہ ناتھ چیف منسٹر اُتر پردیش، تلنگانہ میں اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں اپنے مخصوص انداز میں مہم چلا رہے تھے ادھر بلند شہر میں گائے کے نام پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اور ایک ایمان دار پولیس انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ کو مجمع نے ہلاک کر ڈالا۔ ایک 20 برس کا طالب علم سمیت بھی گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ اب تک جو حالات سامنے آئے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک منظّم سازش تھی۔ سیانا گاؤں کے قصبے مہاور کے ایک گنّے کے کھیت میں گائے ذبح کر کے پیڑ سے لٹکا دی گئی۔ برہم دیہاتیوں اور ہندو یوا واہنی و بجرنگ دل کارکنوں نے گائے کے باقیات ایک ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر چنگر ولی پولیس اسٹیشن لے آئے اور خاطیوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ انھوں نے پولیس کے خلاف نعرہ بازی کی اور بلند شہر ہائی وے پر ٹریفک روک دی۔ یہ واقعہ بلند شہر میں تبلیغی جماعت کے اجتماع، جس میں پندرہ لاکھ افراد نے شرکت کی اس کے دوسرے دن ہوا۔ تبلیغی جماعت میں شرکت کے بعد واپسی بلند شہر کی شاہراہ سے ہی ممکن ہے۔ سیانہ ان کی واپسی کا راستہ ہے۔ جو بلند شہر سے 30 کیلومیٹر دور ہے۔ اجتماع سے واپس ہونے والے افراد سے تصادم کا منصوبہ تھا جس کو انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ نے اپنی جان دے کر روک دیا۔ پولیس نے واپس ہونے والوں کا رخ انوپ شہر کی جانب موڑ دیا اور بڑی صلاحیت کے ساتھ کام لیا۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ انھوں نے گائے کو ذبح کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے کھیت بھی وہیں ہیں اور انھوں نے کھیتوں کی نگرانی کی تھی انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ نے بھی احتجاجیوں کو سمجھایا تو وہ راستہ روکو اندولن سے دستبردار ہونے تیار ہو گئے تھے۔ اچانک ہی ہجوم نے پتھراؤ شروع کر دیا اور تشدد پر اُتر آئے۔ آس پاس کے دیہاتوں سے بھی ٹرکوں میں بھر کر لوگ جمع ہوتے گئے اور پولیس اسٹیشن کر گھیراؤ کیا۔ حالات اتنے سنگین ہوئے کہ پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی۔ جب مجمع پوری طرح بے قابو ہو گیا تو پولیس عہدہ داروں نے پولیس اسٹیشن کی عقبی دیوار توڑ کر وہاں سے راہ فرار اختیار کی۔ اس پورے واقعے میں اہم بات یہ ہے کے انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ کو مار دیا گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق سبودھ کمار کی موت گولی لگنے سے ہوئی لیکن ان کے جسم پر پتھروں کے علاوہ کلہاڑی کے بھی زخم پائے گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ منصوبہ بند سازش تھی یا پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ پولیس ٹیم پر پتھراؤ کر کے انھیں بھاگنے پر مجبور کرنا، انسپکٹر پر کلہاڑی سے قاتلانہ حملہ کرنا اور بچ جانے پر گولی چلا دینا CCTV کیمرے کی ریکارڈنگ شکوک وشبہات کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ پولس مختلف زاویوں

سے تحقیقات کر رہی ہے ایک ایس آئی ٹی ٹیم بھی تشکیل دی گئی ہے، راج کمار جس کے کھیت میں ذبیحہ گائے پائی گئی اور جس نے پولیس میں شکایت بھی درج کروائی تھی۔ پولیس نے اس کے ساتھ بہت ہی برا برتاؤ کیا ہے۔اس کی بیوی پریتی کو بھی بری طرح پیٹا گیا اور گھر کا سارا سامان برباد کر دیا گیا۔راج کمار نے ٹائمس آف انڈیا کے نمائندے سے پولیس ظلم کی شکایت کی ہے۔ایک طالب علم سمیت کمار بھی جو احتجاج کرنے والوں میں شامل تھا ہلاک ہو گیا۔خاص بات یہ ہے کہ انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ نے دادری میں اخلاق ہلاکت کیس کی تحقیقات 28 ستمبر 2015ء اور 9 نومبر 2015ء کے درمیان کی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اس موقع پر ہیمنت کرکرے کی یاد آ گئی۔کیا ہجومی تشدد کا سہارا لے کر ایمان دار پولیس آفیسروں کو بے دردی سے مار دیا جائے گا؟ خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی جماعت کے اجتماع کے شرکاء سے ٹکراؤ ٹل گیا۔جس کے لیے پولیس کا کردار قابل تعریف ہے۔انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ کے جسد خاکی کو ترنگے میں لپیٹ کر پورے اعزاز کے ساتھ 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔انسپکٹر سبودھ کمار سنگھ ایک غیر متعصب ذہن کے آفیسر تھے۔ان کے لڑکے ابھیشک نے اپنے والد کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد فرقہ وارانہ تصادم کو روکتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ یہ ڈراما مقامی غیر سماجی عناصر نے مذہبی تشدد پھیلانے کے لیے رچا تھا۔اب کس کے والد کی باری ہے۔ان کا بڑا لڑکا شریا کمار جو دلی یونیورسٹی کا اکنامکس گریجویٹ ہے اس نے کہا میرے والد مجھے آئی اے ایس بنانا چاہتے تھے لیکن میں اب آئی پی ایس بنوں گا اور فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والی قوتوں کے خلاف جدوجہد کروں گا۔عموماً ایسے واقعات سے بددل ہو کر نوجوان غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔لیکن ان نوجوانوں کا عزم قابل تعریف ہے۔فرقہ وارانہ ذہنیت جس طرح کے نوجوان تیار کرنا چاہتی ہے سب کچھ اس کے برخلاف ہو رہا ہے۔ہم ان نوجوانوں کے عزم و استقلال کو سلام کرتے ہیں۔ ورنہ موجودہ حکومت کا ایجنڈا تو یہی ہے کہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کرنے کی بجائے انھیں ایسے پر تشدد واقعات کے لیے استعمال کیا جائے۔ظاہر ہے ہر نوجوان پکوڑے تو بیچ نہیں سکتا۔وہ فرقہ پرست طاقتوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ہمارے وزیر اعظم اس سارے واقعے سے بے خبر پرینکا چوپڑا کی شادی کے ریسپشن میں شریک ہوئے اور پرینکا اور دیگر مہمانوں سے ہنس ہنس کر ملنے اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف رہے۔حالات بہت نازک ہیں۔ ہندو مسلمان اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب کہ ہندو مسلمان امن چاہتے ہیں۔اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے اجتماع کے لیے بلند شہر کے قرب و جوار کے غیر مسلموں نے ہر طرح کی سہولت فراہم کی۔وی ایچ پی چاہتی ہے کہ حکومت 11 دسمبر سے شروع ہونے والے پارلیمنٹ کے سرمائی سشن کے دوران مندر کی تعمیر سے متعلق بل پیش کرے۔بل منظور نہ ہونے کی صورت میں 31 جنوری کو پریاگ میں منعقد ہونے والے سنتوں کے سنسد کے فیصلے کی پابندی کرے گی۔بی جے پی کے پاس یہی ایک آخری کارڈ بچا ہے۔دیکھئے وہ اس کا استعمال کس طرح کرتی ہے۔لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہندوستان سے بھائی چارہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور نہ انسانیت کبھی مر سکتی ہے۔

2018ء کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اردو میں رحمٰن عباس کو ان کے ناول ''روحزن'' پر دیا گیا۔ہم انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔نامور فکشن نگار حسین الحق کو اس سال غالب ایوارڈ سے نوازا گیا اور دانش اقبال کو ڈراما کے زمرے میں غالب ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔دانش اقبال ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ادارہ ان انعام یافتگاں کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

بیگ احساس

مضمون

گلزار جاوید

مولانا گاؤدی

ہوائی اڈے کے الیکٹرانک ڈسپلے پر اپنی فلائٹ 509 کے بارے میں چوتھی بار تازہ اطلاع دیکھنے گیا تو ہنوز دلّی دُور است والی خبر پڑھ کے دل و دماغ پر طاری بوجھ سیروں کے بجائے منّوں میں تبدیل ہو گیا۔ قبل اس کے مڑ کر اپنی جگہ بیٹھتا کہ ساتھ کھڑی موڈرن خاتون نے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''Excuse Me''

''Yes''

''If I am not wrong'' تم مولانا ۔۔۔گاؤدی۔۔۔میرا مطلب ہے عابد ہونا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے خاتون کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم SSS کی کمانڈو صباحت ہو۔ میرے منہ سے اپنی شناخت سنتے ہی خاتون نہایت بے تکلفانہ انداز میں معانقہ کے لیے آگے بڑھی۔ معاف کیجیے گا آج کل معانقہ کے لیے انگریزی کا لفظ HUG استعمال ہوتا ہے۔ آپ ہی بتلایئے جس لفظ کے صوتی معنی اثرات پر گراں گزریں تو اسے استعمال کرنا مناسب ہے کیا؟

''اور سناؤ کیا حال ہے، کہاں ہوتے ہو، قلموں میں سفید بالوں نے بڑا گریس فُل بنا دیا ہے۔'' اصولی طور پر مہذب طریقہ تو یہ ہے کہ خاتون کتنی موٹی، بھدی، کالی یا پستہ قد کیوں نہ ہو اُس کے لیے چند تعریفی جملے ضرور کہنے چاہیے مگر ہم نے بے ساختہ کہہ ڈالا کہ تم نے بھی تھوڑا سا ویٹ پُٹ آن کیا ہے۔

''صاف صاف کہو نا موٹی ہو گئی ہوں۔''

''میرا مطلب ہے گریس فُل لگ رہی ہو۔ اگر ٹین ایج کے دو یا تین بچے ساتھ کھڑے ہوں تو تمہاری پرسنلٹی اور چارمنگ ہو جائے۔ By the way تمہارے بچے ہیں کتنے؟''

''ایک تو تم مردوں کی یہ بہت بُری عادت ہے کہ ملتے ہی سب سے پہلے بچوں کے بارے میں پوچھتے ہو۔ بھئی ہم خواتین ہیں بچے جننے کی مشین نہیں۔ جب شادی ہو گی تب دیکھا جائے گا۔''

''I am sorry'' اصل میں ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ویسے میں اپنے بارے میں بتا دوں کہ میرے ایک درجن بچے:

''حیرت سے ایک درجن؟''

''جملہ مکمل تو کرنے دو۔۔۔ایک درجن بچے ہوتے اگر شادی ہو جاتی''

''Don't be silly'' یار یہیں کھڑے کھڑے بور کرتے رہو گے یا کوفی بھی آفر کرو گے؟

''Sure'' آؤ۔۔۔کوفی، آئس کریم جو دل کرے۔

''میں خواب تو نہیں دیکھ رہی، یونیورسٹی میں تو تم اس قدر کنجوس مکھی چُوس مشہور تھے کہ الگ ٹیبل پر بیٹھ کر ایک چائے کا کپ منگواتے، ایک ہاتھ سے چائے کا گھونٹ بھرتے اور دوسرے سے باوا آدم کے زمانے کی عینک ٹھیک کرتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل جاتے۔''

''وقت وقت کی بات ہے، اسی مولانا گاؤدی نے SSS بریگیڈ کا وہ پروگرام بھی ناکام بنایا تھا جب میں امتحان کی تیاری کے لیے کالج کے گراؤنڈ کے ایک کونے میں ٹہل ٹہل کر پیپر کی

تیاری کر رہا تھا۔اور جیسے ہی میں نے تم تینوں یعنی تم،سفینہ اور صائمہ کو اپنی جانب آتے دیکھا تو تیز تیز قدموں سے مخالف سمت میں قدم بڑھا دیے۔تم تینوں نے پیچھے سے ایک ساتھ آواز لگائی

''ہائے ہائے کتنا شریف بچہ ہے''

کوفی کا کپ رکھتے ہوئے صباحت نے کہا:

''میرا خیال ہے فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے، تم بھی اسلام آباد جا رہے ہونا،تمہاری فلائٹ کا نمبر کیا ہے؟ میری تو 311 ہے''

''نہیں میری فلائٹ کا نمبر 509 ہے جو وایا لاہور اسلام آباد جائے گی میں لاہور رکوں گا وہاں مجھے کچھ کام ہے۔ایک یا دو روز بعد اسلام آباد آؤں گا۔''

''پھر ملاقات ہونی چاہیے''

''Why Not کہتے ہوئے میں آگے بڑھنے لگا''

''اے اے،او مسٹر۔۔۔کہاں ملو گے مریخ پر۔۔۔''

''کیوں۔۔۔''

''رہے نا مولانا گاؤدی، بھلے آدمی فون نمبر دو گے لو گے تبھی تو رابطہ ہو گا نا''

''سوری کہتے ہوئے میں نے اُس کا نمبر دریافت کر کے اپنے موبائل میں محفوظ کر کے اُس کے موبائل پر بیل دی تو اُس نے ہنس کر ہاتھ کے اشارے سے بائے کیا۔''

لاہور سے آنے کے بعد زندگی اپنے ڈھرے پر چلنے لگی۔صبح کالج شام کو نوٹس کی تیاری اور موبائل پر دوستوں کے گروپ سے چیٹنگ کے بعد کھانا اور حالات حاضرہ سے واقفیت کے لیے کچھ دیر ٹی وی کے آگے بیٹھ کر سو جانا۔

قریب ایک ہفتہ یا شاید دس دن گزرے ہوں گے کہ صباحت کے نام کے ساتھ موبائل کی گھنٹی بجی۔موبائل کا بٹن آن کرنے اور صباحت کا نام دیکھنے کے درمیان ایک سیکنڈ کے وقفے میں درجنوں خیالات ذہن میں گھوم گئے کہ اُسے فون نہ کرنے کا کیا بہانا کیا جائے۔جیسے ہی میں نے موبائل آن کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے غصے سے بھرپور آواز سنائی دی:

''کہاں سے بول رہے ہو؟''

''گھر سے اور کہاں سے''

''میں تو سمجھی تھی کہ آج تمہارا قُل یا چالیسواں ہونا چاہیے''

''دوست اپنے دوستوں کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں اور تم مجھے جیتے جی مارنے پر تُلی ہو!''

''تُلی نہیں اگر تم مل جاتے تو سچ مچ مار بھی دیتی۔''

''سوری مجھے فلو ہو گیا تھا وگرنہ ضرور فون کرتا''

''No arguments معافی اسی شکل میں مل سکتی ہے جب تم گاڑی لے کر آؤ مجھے لونگ ڈرائیو پر لے جاؤ اور واپسی پر کینڈل لائٹ ڈنر کراؤ۔''

شام کو صباحت کے بتلائے ہوئے پتہ سے اُس کو پک کیا اور ہم دونوں لونگ ڈرائیو پر نکل گئے۔گاڑی چلے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ صباحت نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

''ہاں جی، مولانا گاؤدی صاحب اب بتلاؤ جناب نے شادی کیوں نہیں کی اور جناب کے ایک درجن بچے ہوتے ہوتے کیوں رہ گئے؟''

''ہم شریف لوگ ہیں ، لہٰذا خواتین کا احترام کرنا جانتے ہیں اس لیے Ladies First کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے یہ حق تمہیں دیتے ہیں کہ پہلے تم بتلاؤ کہ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''بکواس نہ کرو، خواتین کا احترام، My Foot

شادی کرتے وقت ماں باپ لڑکی کو یہ کہہ کر رخصت کریں کہ بیٹا باپ کے گھر سے ڈولی نکلے اور شوہر کے گھر سے جنازہ، سبحان اللہ، شادی کے بعد بیٹا ہو جائے تو شوہر نامدار چھاتی پھلائے پھریں اور اگر بیٹی ہو جائے تو بیچاری بیوی موردِالزام ٹھہرائی جائے اور کسی وجہ سے اولاد نہ ہو تو بیوی کو طرح طرح کے حکیموں، ڈاکٹروں، پیروں فقیروں کے پاس لیے پھریں۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ بھائی شوہر نامدار کا بھی چیک اَپ کرالو۔ کیوں کہ یہ male chauvinism کی اَنا کے خلاف ہے۔ جیسے ہی حکیم، ڈاکٹر یا پیر نے نفی میں جواب دیا اور مزاجی خدا دوسری شادی کے خواب دیکھنے لگے جس میں اُن کی امّاں رنگ بھرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہوتی ہیں۔ دوسری طرف بچے فیل ہو جائیں یا کم نمبر لے آئیں تو خاتونِ خانہ کی شامت، کھانے میں مرچ مصالحہ اوپر نیچے ہو جائے تب خاتونِ خانہ کی شامت، آمدن کم خرچ زیادہ ہو تب خاتونِ خانہ موردِالزام، بیاہ شادی یا کوئی تقریب ہو تو خواتین کی باری مردوں کے بعد، سچ سچ بتاؤ اس بوسیدہ لفظ کو ڈکشنری سے خارج نہیں کر دینا چاہیے۔''

''یار ایک بات بتاؤ تم نے وہاں کوئی N.G.O وغیرہ تو Join نہیں کر لی؟''

''یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''بھئی جس طرح تم نے میرا یعنی مردوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اُس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''بات کا رُخ مت پھیرو اگر نہیں بتانا چاہتے تو صاف صاف کہو۔''

''آ آ آ آہ۔۔۔۔ ہا۔۔۔ کہاں تک سنو گی کہاں تک سناؤں''

''جہاں تک تمہارا جی چاہے یا جہاں تک تم مناسب سمجھو''

''ہوں۔۔۔۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ نہیں کہ میری پیدائش کے فوری بعد میری والدہ انتقال کر گئی تھیں جس کے کچھ عرصے بعد والدین کے اصرار پر میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری والدہ کے بطن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ مگر یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ میری دوسری والدہ ایک اوسط درجے کے گھرانے کی نیم خواندہ خاتون تھیں جن کے ہاں مذہب کا تصور بہت محدود اور مخصوص قسم کا تھا یعنی نیم مُلّا، نیم حکیم، نیم پیر فقیر کی نیم خواندہ اور ضعیف الاعتقادی کچھ اس طرح ہمارے گھر میں آئی کہ ایک علمی، ادبی گھرانہ جو روشن دماغی کے ساتھ اعلیٰ قدروں کا حامل بھی تھا وہ کٹھ مُلائیت کی گرفت میں قید ہو کر رہ گیا۔''

''Oh my God تم۔۔۔ تم کس طرح الگ ہو''

''اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ میں والد صاحب کی لاڈلی اولاد تھا جو ہماری دوسری والدہ کو پسند نہ آتا تھا۔ پھر تعلیم کی طرف میرا رجحان اور شوق کو دیکھتے ہوئے والد صاحب نے مجھے میرے چچا کو سونپ دیا تھا کیونکہ چچا کالج میں پروفیسر تھے اس لیے میرے تعلیمی مراحل آسانی سے طے ہوئے اور اُنہی کی راہنمائی میں مَیں نے بھی مدرس بننے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تمہارا SSS گروپ میرا مذاق صحیح اڑاتا تھا کیونکہ میں حالات کے ہاتھوں اتنا پس چکا تھا کہ مجھے ہر چیز سے خوف بھی آتا تھا اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی شدت سے ستاتا تھا۔''

''I am Sorry جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا پلیز مائنڈ مت کرنا''

''ارے نہیں۔۔۔ تم لوگوں کی باتیں تو مجھے کچھ کرنے کا حوصلہ دیتی تھیں اور میرے لیے Energy کا کام کرتی تھیں۔ ہاں

تو میں بتلا رہا تھا کہ میرے تینوں سوتیلے بھائی مختلف مدارس میں نیم خواندہ مولویوں کے ہاتھوں خود بھی مولوی بن گئے۔ ایک کہتا کہ داڑھی کے ساتھ مونچھے رکھنا خلاف شرع ہے۔ دوسرا کہتا مونچھوں کے بغیر داڑھی رکھنا خلافِ سنت ہے۔ تیسرا کہتا کہ ٹخنوں کے نیچے شلوار کا ہونا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح داڑھی کی قامت کے بارے اُن کے درمیان اختلاف پایا جاتا۔کوئی مٹھ بھر داڑھی کو شریعت سے منسوب کرتا کوئی گز بھر داڑھی کو اور ایک تو خط پر بھی اکتفا کرنے کو تیار ہوتا۔اس کے علاوہ گھر میں مسالک کی بحث بھی زور شور سے رہا کرتی۔کوئی امام ابوحنیفہ کو درست گردانتا کوئی امام شافع کو، کوئی امام مالک کو اور کوئی امام حنبل کو اور کوئی ان سب کو ملوکیت سے تعبیر کرتا۔ اسی طرح شیعہ سُنی، دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث کی تکرار بھی رہا کرتی۔ جو کوئی ایک دوسرے کے نکتہ نظر سے اختلاف کرتا وہ کافر ٹھہرایا جاتا۔‘‘

’’یار عابد تمہاری زندگی تو بڑی تکلیف دہ ہے‘‘

ابھی کہاں۔۔۔تینوں میں سب سے بڑے صاحب ایک دن تبلیغ کا کہہ کر گھر سے گئے اور مڑ واپس نہ آئے۔ ہفتہ، مہینہ، دو مہینہ جب ایک سال گزر گیا تو والد صاحب کی حالت خراب ہو گئی۔ میں والد صاحب کو دیکھنے گیا تو اُنہوں نے بھرّائی آواز میں میرا ہاتھ تھام کر کہا ’’تُو میرا سمجھ دار بیٹا ہے مجھے تم سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔تُو سمجھ رہا ہے میرا اشارہ کس طرف ہے‘‘ میں نے والد صاحب کی گفتگو کے جواب میں مختصراً ’’جی‘‘ کہہ کر بات ختم کرنا چاہی تو والد صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ’’کچھ کر بیٹا کچھ کر۔۔۔ اپنے بھائی کو کسی طرح ڈھونڈ کے لا دے میری آنکھیں اُسے دیکھنے کو ترس رہی ہیں‘‘

’’پھر تم نے کیا کِیا؟‘‘

’’کرنا کیا تھا۔ علامہ اقبال کے شعر کی تصویر بن کر دشت اور دریا میں گھوڑے دوڑا دیے۔ سارے تعلقات، ساری واقفیت، سارے مراسم کام میں لانے کے بعد پتہ چلا کہ صاحبزادے کابل کی جیل میں ہیں۔اسے میری خوش نصیبی کہو کہ وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کا بیٹا میرا طالب علم تھا جن کے تعاون سے قریب دو ماہ کی کاوش کے بعد صاحبزادے آئے تو کسی طرح کی شکر گزاری یا فرمانبرداری کے بجائے بڑے کرّ وفر اور اس شان سے آئے کہ اُن کے دوستوں اور حامیوں نے اُنہیں ہار پھول سے ڈھک دیا۔ وجہ دریافت کی تو کہا گیا کہ جہاد سے واپس آئے ہیں۔‘‘

’’جہاد۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔۔۔ کس کے خلاف؟‘‘

’’خدا جانے ۔۔۔ وہی امریکی فوجی وغیرہ جو افغانستان میں آئے ہوئے ہیں اُن کے خلاف سوات میں رہنے والے کسی صوفی صاحب کے پانچ ہزار مجاہدین میں یہ بھی شامل تھے۔‘‘

’’تو انہوں نے کیا کِیا۔۔۔؟‘‘

’’کرنا کیا تھا آدھے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے گئے اور آدھے جیلوں میں ڈال دیے گئے۔‘‘

’’اب کیا کرتے ہیں وہ۔۔۔؟‘‘

’’ٹھیکیداری۔۔۔!‘‘

’’کس چیز کی۔۔۔؟‘‘

’’اسلام کی۔۔۔‘‘

’’Oh my God، اب اپنی شادی کا بھی تو کچھ بتلاؤ؟‘‘

’’بھئی نوکری کے پانچ سال تک جو بچت کی اُس کی لے لی گاڑی، اُس کے دو سال بعد کی ساری کمائی صاحبزادے کو چھڑانے پر لگ گئی۔اس کے بعد والد صاحب نے انٹرفیل اور

میٹرک فیل دوسرے بھائیوں کو سیٹ کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔تم تو جانتی ہو آج کل بی۔اے،ایم۔اے تو کیا ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیے لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں اور جاب نہیں ملتی۔تو میٹرک فیل اور انٹر فیل کو کوئی کیا نوکری دیتا۔مجھ سے جتنا بن پڑا یا جتنا میرے پاس تھا اُس سے میں نے دونوں کو کاروبار کرا دیا۔ایک کو میڈیکل اسٹور اور دوسرے کو سنار کی دُکان کھلوا دی۔اب وہ ہر سال حج پہ بھی جاتے ہیں،عمرہ پر بھی جاتے ہیں اور تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگاتے ہیں اس کے باوجود اُن کے اخراجات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور میں اچھی بھلی تنخواہ لینے کے باوجود بیس سال کے بعد بھی Hand to mouth ہوں۔اب تم ہی بتلاؤ۔۔۔نا میرے پاس اپنا گھر ہے،نا بینک بیلنس ہے اور نا کوئی اور اثاثہ۔ایسے میں شادی کرنا کہاں کا انصاف ہے۔چلو چھوڑو میری رام کہانی پوری ہوئی اب یہ بتلاؤ کہ ڈِنر کہاں کرنا ہے؟''

''آج نہیں پھر کسی دن،تمہاری باتوں سے بھوک مرگئی ۔''

اب کی بار ڈر کے مارے میں نے صباحت کو تیسرے دن ہی فون کرلیا۔حال چال پوچھنے پر بولی''میں ابھی تک شاک میں ہوں۔تم نے کس قدر Sacrify کیا اور اُس کا صلہ تمہیں کچھ بھی نہیں ملا۔''''میں نے کہا چھوڑو ہر کسی کو اپنے حصے کے دکھ سکھ بھوگنے پڑتے ہیں۔تم یہ بتاؤ کہ میں کتنی دیر میں تمہیں لینے آؤں؟'' جواب میں اُس نے کہا''آج نہیں میں خود کسی دن فون کروں گی''

تین دن بعد میں نے اُسے پھر فون کیا تو وہ شوخی سے بولی''ارے مولانا گاؤدی یہ گھڑی گھڑی فون کی وجہ کیا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں خود فون کروں گی،کہیں عشق تو نہیں ہوگیا مجھ سے؟''

''تمہیں حق پہنچتا ہے جتنا جی چاہے مذاق اڑالو۔میں نے تو یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ ڈِنر کا کیا ہوا؟''

''لگتا ہے مولوی بھائیوں کا کوئی اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو پیٹو ضرور ہوگئے ہو تم،یار صبر کرو میں خود فون کروں گی۔''

''میں نے ڈر کے مارے فون کرنے سے توبہ کرلی مگر پانچویں روز اُس کا خود فون آگیا۔''

''پروفیسر۔۔۔کیا کررہے ہو؟''

''میں نے حیرت سے کہا۔۔۔ پروفیسر۔۔۔کون پروفیسر۔۔۔؟''

''رہے نا۔۔۔مولانا گاؤدی۔۔۔غلطی سے تمہیں کہا تھا۔سو جناب اپنے الفاظ واپس۔آج رات کو آٹھ بجے میں آپ کا انتظار کروں گی۔آٹھ بجے کا مطلب آٹھ بجے ہی سمجھیے گا۔''

میں نے گاڑی اُس کے گھر کے قریب کھڑی کر کے موبائل پر بیل دی تو دوسری طرف سے آواز آئی''پردہ کرنے لگے ہو کیا''میں نے کہا ایسا تو نہیں تم باہر آجاؤ تو پھر ساتھ چلتے ہیں۔جواب میں بولی''پہلے تم اندر آؤ''گاڑی پارک کر کے جوں ہی میں نے ڈور بیل بجائی تو اُس نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر آنے کو کہا۔گھر میں قدم رکھتے ہی علیک سلیک کے بغیر اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور ڈائننگ ٹیبل پر لے گئی۔ڈائننگ ٹیبل نا صرف خوشبودار کھانوں سے سجی ہوئی تھی بلکہ ہر ڈش کے درمیان خوبصورت پھولوں کا گلدستے بھی سجے ہوئے تھے اور درمیان میں لکڑی کے خاص ڈیزائن کردہ کینڈل اسٹینڈ پر ایک بڑی موم بتی بلند شعلے کے ساتھ جل رہی تھی۔میرے منہ سے بے ساختہ نکلا''یہ کیا ہے؟''

''بندہ پرور۔۔۔حضور اعلیٰ۔۔۔یہ اس ناچیز کی دعوت ہے''

''دعوت۔۔۔تمہاری۔۔۔یہاں۔۔۔؟''

''کیوں کوئی اعتراض ہے، بے شک ہو اب تو کھانا پڑے گا۔گذشتہ دس دن سے تیاری میں لگی ہوئی ہوں۔''

''آٹھ بجے ہی کھانا کھلا دوگی۔۔۔؟''

''نہیں جناب۔۔۔ مہذب لوگ کھانے سے پہلے سوپ پیتے ہیں، حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے ہیں، اسنیکس لیتے ہیں پھر جا کر کھانے کی باری آتی ہے۔۔۔تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ سوپ تمہیں پسند آیا ہے مگر تعریف میں کنجوسی سے کام لے رہے ہو۔۔۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔ میں نے اتنا لذیذ سوپ پہلے کبھی نہیں پیا۔ میں تو سوچتا تھا کہ تم صرف لوگوں کو بیوقوف ہی بنا سکتی ہو مگر اب احساس ہو رہا ہے کہ تم کُک بھی کمال کی ہو۔''

''مذاق نہ کرو، پہلے کھانا کھاؤ پھر کوفی پیو پھر جی چاہے جتنی تعریف کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا خیال ہے گفتگو کا سلسلہ آگے نہ بڑھایا جائے؟''

''لگتا ہے تمہیں کہیں جانا ہے!''

''نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔''

''تو پھر جلدی کس بات کی ہے۔ کھانے کے بعد آرام سے گفتگو کریں گے۔''

''کھانا میری توقع کے برخلاف کافی لذیذ اور منفرد تھا۔ مغرب میں ایک عرصہ گزارنے کے باوجود شاہی ٹکڑے اتنے ہی لذیذ تھے جتنے لذیذ بچپن میں کھائے تھے۔ قورمہ اور اسٹو کے علاوہ اُردکی بھُنی ہوئی دال اس طرح پکی ہوئی تھی کہ زمین پر بکھیر کر ایک ایک دانہ چُن لو۔ میں نے صباحت سے کہا کہ تم نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔ تو اُس نے بتایا کہ اُس کی والدہ وہاں پر بھی یہی کھانے پکاتی ہیں اور جب کسی کا دل مغربی کھانے کا ہوتا ہے تو وہ بازار جا کر کھا آتا ہے یا آرڈر کر دیتا ہے۔ کھانے کے آخر میں مہمان نوازی کا تقاضا پورا کرتے ہوئے صباحت نے بھی رسمی جملے کہے کہ تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا۔ تمہیں اچھا نہیں لگا وغیرہ۔۔۔ جواب میں مَیں نے صرف اتنا کہا ''کوفی ملے گی؟'' Sure کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف لپکی۔''

قبل اس کے کہ تم میرے بارے میں سوالات کرو میں خود ہی تمہیں تفصیل سے بتلائے دیتی ہوں۔ ہم لوگ اچھے بھلے اپنے وطن میں رہ رہے تھے کہ ابو نے پہلے بڑے بھائی کو اور پھر مجھ سے چھوٹے کو پڑھائی کی غرض سے باہر بھیج دیا۔ دونوں بھائی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد واپس آنے کے بجائے وہیں سیٹل ہو گئے بلکہ اس سے پہلے انہوں نے میرا داخلہ بھی ایک یونیورسٹی میں کرا دیا۔ میں نے لاکھ منع کیا مگر امّی ابّو کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی۔ تو جناب مولانا گاؤدی صاحب میں نے تعلیم مکمل کرتے ہی جب امّی ابّو سے واپس آنے کا ذکر کیا تو وہ بہت ناراض ہوئے بولے: ''تمہارے دونوں بھائی واپس آ نہیں رہے تم بھی آ کر اپنے گھر چلی جاؤ گی تو ہمارا کیا بنے گا؟'' لہٰذا میں نے بھائیوں کی مدد سے پہلی کوشش یہ کی کہ امّی ابّو کو اپنے پاس بلایا جائے۔ جو کام نیک نیتی سے کیا جائے اُس میں اللہ تعالیٰ کامیابی بھی دیتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد امّی ابّو کو ایک سال کا ویزہ مل گیا جسے ہم نے ریزیڈنسی میں تبدیل کرا لیا۔

امّی ابّو کی ساری کوشش میری شادی کے لیے وقف ہو گئی۔ اوّل تو کوئی مناسب رشتہ نہ ملتا اور اگر کوئی قابلِ غور رشتہ ہوتا تو میں اُسے رد کر دیتی ۔ سلسلہ ابھی آگے چلتا کہ چھوٹے بھائی صاحب نے گُل کھلا دیا اور ایک دن اپنی گرل فرینڈ کو Positive Report کے ساتھ گھر لے آئے۔ لڑکی اپنے وطن کی تھی مگر جس طرح کا حجاب اُس نے لے رکھا تھا اُس سے اُن کی فیملی کی بابت اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ امّی ابّو بہت جُز بُز ہوئے اور مشرقی والدین

کی طرح بھائی کو گھر سے نکل جانے کی دھمکی بھی دی جس کے جواب میں کسی قسم کا Reaction دکھلائے بغیر وہ پلٹ کر جانے بھی لگا مگر میں نے اُسے ''ٹھہرو'' کہہ کر روکا اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے امّی ابو کو اندر لے گئی۔ امّی ابو پڑھے لکھے انسان تھے میری دلیل کے جواب میں خاموشی اختیار کر کے رضا مندی کا سگنل دے دیا اور دوسرے دن مسجد میں جا کر سادگی سے نکاح کر دیا۔ البتہ یہ دیکھ کر دل کو دھچکا لگا کہ وہ لوگ مغرب میں رہ کر بھی چہرے مہرے، لباس اور بود باش سے پڑھے لکھے ہرگز نہ لگتے تھے۔

بڑے بھائی نے اس رشتے پر بہت واویلہ مچایا۔ یہاں تک کہہ بیٹھے کہ مجھ سے بڑا اُلو کا پٹھا کوئی نہیں کہ گھر کی تمام ذمہ داریاں میں نبھاتا ہوں اور شادی چھوٹے صاحب کر بیٹھے۔ بیشک چھوٹا بھائی ابھی کچھ نہیں کرتا تھا مگر میں اتنے پیسے ضرور کما رہی تھی کہ اپنا اور امّی ابو کا خرچ آسانی سے اٹھا سکوں۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور بڑے بھائی سے جلد اُن کا رشتہ تلاش کرنے کا وعدہ کر کے بات کو رفع دفع کیا۔

بھائی کے جانے کے بعد امّی ابو کو کمرے میں روتا دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے چمٹا لیا اور بولے ''کاش ہماری ایک ہی اولاد ہوتی''۔ میں نے امّی ابو کو ماضی، حال، مستقبل کے حوالے دے کر کسی قدر مطمئن کرنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت ہوئی۔ مسئلہ ایک اور سر ابھارنے لگا۔ امّی ابو کا اصرار تھا کہ پہلے میرا رشتہ کیا جائے جبکہ میری خواہش بڑے بھائی کا رشتہ کرنے کی تھی۔ اس مسئلے کا میں نے یہ حل نکالا کہ امّی ابو کو فری ہینڈ دے دیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں جب چاہیں میرا نکاح کر دیں اور میں شدّ و مد سے بھائی کے لیے خود بھی لڑکی ڈھونڈنے لگی اور بھائی کو بھی اس سلسلے میں متحرک ہونے کی تاکید کی۔

آٹھ ماہ بعد گھر میں ایک فرد اور ایک داڑھی کا اضافہ ہی نہیں بلکہ چھوٹے بھائی صاحب نے مغربی لباس ترک کر کے ٹخنوں سے اونچی شلوار، کرتا اور دوپلّی ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی۔ انہی دِنوں بڑے بھائی کے دفتر میں ایک صاحب کام کرتے تھے جنہوں نے بھائی سے راہ و رسم بڑھانے کے ساتھ اُنہیں صوم وصلوٰۃ کا پابند کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اس کوشش میں اُن صاحب سے زیادہ اُن کی اکلوتی صاحبزادی کا دخل تھا جس کے لیے بڑے بھائی نرم گوشہ رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے بڑے بھائی کی باتوں سے اندازہ لگا کر کہا کہ اگر آپ کہیں تو میں اور امّی آپ کا رشتہ لے کر اُن کے گھر چلے جائیں۔ بڑے بھائی کی خاموشی ایک طرح سے رضا مندی تھی اس لیے میں اور امّی دوسرے روز ہی بڑا سا کیک لے کر اُن کے گھر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اُن لوگوں نے جس گرم جوشی کا اظہار کیا اُس سے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہ تھا کہ وہ ہماری آمد کے منتظر تھے۔ بظاہر ہماری تجویز پر اُنہوں نے غور کرنے کا وعدہ کر کے خاطر تواضع کے بعد ہمیں رخصت کیا اور چند دن بعد ہی بڑے بھائی سے کہا ''اپنے گھر والوں سے کہیے کہ کسی دن چائے پر آئیں یا ہمیں بلائیں'' بڑے بھائی نے جیسے ہی یہ اطلاع دی میں نے فوراً اُن لوگوں کو دوسرے دن شام کی چائے پر مدعو کر لیا۔

ہم تو صرف کیک لے کر گئے تھے وہ باقاعدہ تحائف لے کر آئے جس کا مطلب یہ تھا کہ اُنہوں نے رشتہ قبول کر لیا ہے۔ جب والد صاحب نے اُن سے رشتے کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے کہا ''مناسب تو نہیں لگتا اگر آپ ہماری درخواست قبول کر لیں تو ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں'' ابو نے قدرے بیزاری سے کہا ''جی فرمایئے''، ''اصل میں ہماری کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے صرف ایک بیٹی ہے اور اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہماری خواہش ہے کہ بیٹا ہمارے ساتھ رہے'' قبل اس کے ابو کوئی جواب

دیتے میں نے ابّو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا ’’یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے‘‘ میرا جواب سُن کر بڑے بھائی کی باچھیں کِھل گئیں امّی کا منہ لٹک گیا اور ابّو کا منہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ القصہ مختصر اگلے مہینے کی سات تاریخ طے پا گئی۔ تیس باراتی لانے کی اجازت دی اور کوئی شرط ہو تو وہ بھی دریافت کرنا چاہی جس کا جواب ہماری طرف سے نفی میں پا کر دونوں میاں بیوی خوش ہوگئے۔

چھوٹے بھائی کو ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی لہٰذا وہ اپنی بیگم کو لے کر ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ بڑے بھائی سسرال میں رہنے لگے۔ ہفتہ دس دن سے شروع ہو کر ملاقات کا وقفہ مہینے دو مہینے تک جا پہنچا۔ امّی ابّو کی تمام کوشش کے باوجود میرے لیے کوئی مناسب رشتہ اس لیے دستیاب نہ ہو سکا کہ میری عمر تیزی سے بڑھ رہی تھی جبکہ لڑکے نوخیز لڑکیوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بڑے بھائی نے قطعی طور پر تو ہاتھ نہیں کھینچا تھا البتہ اونٹ کے منہ میں زیرہ برابر جب آتے کچھ نہ کچھ امّی کے ہاتھ میں تھما جاتے۔ ایک مرتبہ وقفہ طویل ہوا تو میں نے سوچا کہ ہم لوگ جا کے خود مل آتے ہیں۔ ہمارا جانا اُن لوگوں کے لیے کسی طرح سے کوئی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا البتہ ایک بات جس نے ہمیں چونکایا وہ بڑے بھائی کے چہرے پر کھچڑی داڑھی تھی۔ روزمرہ شیو کرنے کے باعث ہمیں کبھی احساس نہ ہوا اب غور سے دیکھا تو اُن کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی چمکنے لگی تھی۔

بظاہر ہمارے خاندان کی گاڑی جیسے تیسے رواں دواں تھی کہ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی دونوں ایک ساتھ آ کر امّی ابّو کے کمرے میں بیٹھ کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں چائے بنا کر لے گئی اور بڑے خوشگوار موڈ میں کہا ’’خیر تو ہے باپ بیٹوں میں بڑی گاڑھی چھن رہی ہے‘‘ ابّو نے تو میری طرف دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی البتہ بڑے بھائی میری طرف دیکھ کر بولے ’’تمہاری باتیں ہو رہی ہیں‘‘ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ’’میری‘‘ بڑے بھائی نے بھی ذرا ترش انداز میں ’’ہاں تمہاری‘‘ اب امّی نے دھیمے لہجے میں کہا ’’بیٹا تمہارے بھائی چاہتے ہیں کہ تم حجاب لینا شروع کر دو‘‘ میں نے کبھی امّی ابّو کو جواب نہیں دیا مگر اُس روز جانے کیا ہوا کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ’’کیوں لینا شروع کر دوں‘‘، ’’اس لیے کہ تمہارے بھائی یہی چاہتے ہیں‘‘ میرا جواب سن کر بڑے بھائی کی آنکھوں میں غصہ اُتر آیا ’’زیادہ بکواس کرنے کی کوشش کی تو یہیں گلا دبا دوں گا‘‘ میری گردن کو ہاتھوں میں تھامتے ہوئے دہاڑے۔ ’’اسے سمجھا دینا‘‘ امّی کی طرف منہ کر کے ’’اگر یہ ایسے باز نہ آئی تو ہمیں سمجھانا آتا ہے‘‘

اُس دن کے بعد سے امّی ابّو دونوں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے میری منّت، ترلا، خوشامند کرتے کہ بیٹا بھائیوں کی بات ماننے میں کیا حرج ہے ’’میں غصے سے کہتی میں نے کبھی اُن کی زندگی میں دخل دیا ہے‘‘ امّی سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں ’’بیٹا کہتے تو تیرے بھلے کی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی ہدایت کر رہے ہیں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہے‘‘ میں خود پر قابو پاتے ہوئے جواب میں طنزیہ لہجے میں کہتی ’’اسلامی تعلیمات‘‘ امّی کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتیں ’’توبہ کر بیٹا، توبہ کر‘‘ میری برداشت جواب دے جاتی ’’توبہ بھی میں کروں امّی کچھ تو خدا کا خوف کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے حقوق اللہ پر حقوق العباد کو فوقیت دی ہے۔ مجھے اسلام کے دائرے میں جکڑنے والوں سے آپ یہ تو پوچھیے کہ وہ اپنے ماں باپ اور بہن کی نسبت کس قدر اسلامی فرائض ادا کر رہے ہیں؟‘‘

میں تو ایک عورت ہوں، کمزور و ناتواں عورت، طاقتور اور منہ زور بھائیوں کے آگے سپر ڈالنا میری مجبوری تھی مگر یہ مجبوری

دوسرے دن ہی اُس وقت گلے کا طوق بن گئی جب مجھے دفتر سے یہ کہہ کر فارغ کر دیا گیا کہ ہمارے ہاں جنونی مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق میرے لیے سرِ دست حجاب اتارنا ممکن نہ تھا۔ دونوں بھائی یہ کہہ کر چلے گئے کہ اللہ کے نبیؐ نے دین کی ترویج کے لیے بے پناہ صعوبتیں برداشت کی ہیں تو کیا تم ایک نوکری کی قربانی نہیں دے سکتی۔ بھائیوں کا ارشاد بجا مگر اُن کا یہ حق نہیں بنتا تھا کہ وہ اپنے والدین کی ضروریات کی مد میں کچھ کرتے جو میری تنخواہ سے پورے ہو رہے تھے۔ الٹا ہوا یہ کہ اُن کی آمدن میں وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور ہم لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے لوگوں کے گھروں، دکانوں اور فیکٹریوں میں چھوٹے چھوٹے کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لفظ ہم لوگ پر چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بوڑھے والدین بھی اس مشقت کو جھیلنے پر مجبور تھے۔

بات یہاں تک ہوتی تو ہم برداشت کر لیتے کیونکہ ہم تو سختیاں جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک دن ڈور بیل پر ایک صاحب کو کھڑے دیکھا تو میں ابوّ کو بلانے کے لیے پلٹی۔ پیچھے سے آواز آئی ''باجی'' مڑ کر میں نے غور کیا تو چھوٹا بھائی بمعہ بیگم کھڑا تھا۔ میں نے کہا خیریت تم اس حالت میں، میرے کاندھے پر سر رکھ کر بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے کہا اندر آؤ اُس کی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا اور اُس کے آنسو صاف کر کے وجہ جاننا چاہی تو بولا ''روز صبح میرے فلیٹ کے آگے گاربیج کا ڈھیر لگا ہوتا تھا میں جس پڑوسی سے بات کرتا وہ شانے اچکا کر آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن ایک پڑوسی کو میں نے گاربیج کا شاپر رکھتے ہوئے دیکھ لیا تو تُو میں میں اتنی بڑھی کہ سارے فلیٹس کے لوگ نکل آئے۔ انہوں نے نا صرف مجھے مارا پیٹا بلکہ میری داڑھی مونڈھ کر میرا سامان بھی فلیٹ سے باہر پھینک کر کہنے لگے دفع ہو جاؤ مسلم جنونیوں۔ آئندہ ادھر نظر آئے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے''

''تم لوگوں کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی''غصہ سے لال پیلی ہوتی صباحت نے بھائی کو فرسٹ ایڈ دیتے ہوئے''کہ ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی لگتی ہے۔ بزرگوں نے بھی کہا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس''

''تمہارا کیا خیال ہے میں نے بھیس بدلا ہوا ہے؟''چھوٹے بھائی نے چیختے ہوئے بہن سے دریافت کیا۔

''بھئی کچھ بھی کہہ لو تم لوگوں کا وہ حساب ہے کہ سہولتیں یہاں کی اور کلچر وہاں کا''

''کون سی سہولتیں حاصل کر لیں میں نے یہاں آ کر، بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں تب بھی گزارہ نہیں ہوتا''

''زیادہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ابھی ڈالر ایک سو آٹھ روپے سے صرف آٹھ روپے پر آ جائے، میں دیکھتی ہوں تم میں سے کتنے اِدھر کا رُخ کرتے اور کتنوں کے پیٹ میں اسلام کا مروڑ اٹھتا ہے۔''

''فضول کی باتیں مت کرو باجی! اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک میں صاف صاف فرمایا ہے کہ یہ زمین اُس کی بنائی ہوئی ہے اور اُس کے بندے جہاں چاہیں جیسے چاہیں رہ سکتے ہیں۔''

''میرے پیارے بھائی یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ اُن کا ملک ہے، اُنہوں نے محنت کی اور ترقی میں آگے نکل گئے۔ اب اُن کی مرضی ہے وہ جیسی بود و باش چاہیں اپنائیں ہم کون ہوتے ہیں اُس میں دخل دینے والے۔ سچ سچ بتاؤ اگر یہی لوگ تمہارے ملک میں آ کر اپنا کلچر عام کریں تو تمہاری سوچ کیا ہوگی؟''

''گچّی دبادوں گا سالوں کی۔''

''زبانی کلامی گچّی دباتے رہنا اور وہ عملی طور پر ہماری

شہ رگ دبائے ہوئے ہیں، بڑے آئے کچّی دبانے والے۔'' بڑبڑاتی ہوئی کچن کی جانب چلی گئی۔

بہت دن ہوگئے ہیں جو روکھی سوکھی ہم کھا رہے تھے اُس میں دو افراد کا اور اضافہ ہوگیا ہے۔ نا بھائی کبھی پوچھتا ہے نہ بھابھی کہ میری جوان بہن اور میرے بوڑھے ماں باپ کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور اس گھر کا نظام کیسے چلتا ہے۔

ایک دن میں مزدوری پر گئی ہوئی تھی کہ امّی ابّو بڑے بھائی کے پاس اپنی بپتا لے کر گئے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میری بیٹی محنت مشقت کر کے ہمارا پیٹ پال رہی ہے۔ کیا ہماری نسبت تمہارا کوئی فرض نہیں بنتا۔ بقول ابّو جب وہ بڑے بھائی کے گھر گئے تو بڑے بھائی نے پس مژدگی کے عالم میں دروازہ کھول کر بڑی گرم جوشی سے ابّو کو گلے لگایا اور بولے ''آپ نہ آتے تو آج شام میں آپ کی طرف آتا'' ابّو نے وجہ پوچھی تو بتلانے لگے کہ میں اپنے شہر سے جہاز کے ذریعے دفتری کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جا رہا تھا کہ ایک عورت نے اُٹھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ اس داڑھی والے کو اتارو یہ دہشت گرد ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے جہاز کی تمام سواریاں میرے خلاف ہوگئیں اور انتظامیہ نے مجھے جہاز سے آف لوڈ کر دیا۔ جوں ہی میں جہاز سے باہر آیا پولیس میری منتظر تھی۔ ہر چند تین دن کی قید میں پولیس نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا مگر اس قدر ذہنی کوفت پہنچائی کہ مجھے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑا۔ بڑے بھائی کی باتیں سن کر ابّو آب دیدہ ہو کر بولے ''کاش بیٹا میں کسی قابل ہوتا'' بڑے بھائی نے ابّو کے ہاتھ میں ایک بڑی رقم پکڑاتے ہوئے کہا ''ابّو سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ رقم لیجیے اور جس طرح مناسب سمجھیں واپسی کی تیاری کیجیے ہم پھر سے اپنا گھر، اپنا وطن آباد کریں گے'' بڑے بھائی کی بیوی کی نسبت ابّو نے سوال کیا تو بھائی نے کہا ''اُس کی مرضی ہے ساتھ چلے یا یہاں رہے ہم اب یہاں نہیں رہیں گے''

صباحت نے آ کر گھر خریدا، سیٹ کیا پھر والدین کو بلایا اور پھر بھائیوں کو۔ اُس کی دونوں بھابھیاں بھی خوشی خوشی آنے پر رضامند ہوگئیں۔ اب وہ لوگ اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہیں۔ ایک ساتھ رہتے ہیں اُن کا گھر جنت کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ صباحت نے اپنی خوشی میں مجھے شریک کرنے کے لیے کینڈل ڈنر پر بلایا ہے۔ آج نجانے میں بھی کیوں خصوصی تیاری کے ساتھ صباحت کے ہاں کینڈل ڈنر پر جا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اُس کے گھر والوں پر اچھا تاثر قائم ہو سکے۔

☆☆☆

شرح
دیوانِ غالب
شارح
سید محمد ضامن کنتوری
مرتبہ
اشرف رفیع
قیمت: -/1200 روپے
-/800 طلباء ایڈیشن
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
www.ephbooks.com

افسانہ

عارف خورشید

عشرتِ قطرہ ہے

ایک دن جماعت کے ایک دوست سے مار کھا کر روتا ہوا گھر پہنچا تو ماں نے اور مارا کہ روتا ہوا آیا۔اسے مار کر آتا تو مجھے خوشی ہوتی۔ میں تجھ پر فخر کرتی مگر تو بزدل پیدا ہوا ہے۔ماں اسے ظلم کے خلاف لڑنے والے بہادر تلوار بازروں کے قصے سناتی۔سمجھاتی، ڈر کر جینے سے موت بہتر ہے کا درس دیتی۔ٹیپو سلطان کا قول اکثر دہراتی۔شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسال کی زندگی سے بہتر ہے۔

سخت مزاج چپراسی کو جماعت چہارم میں چاقو دکھا کر فرار ہونے والا یہ طالب علم پھر لوٹ کر اسکول نہیں گیا۔جو کچھ سیکھا وہ حالات اور سماج کی بے رحمیوں نے سکھایا۔چونکہ ابتداء چاقو کی نوک سے ہوئی تھی۔اس لیے زندگی کے تمام مسائل حل کرنے دولت کمانے اور نام ونمود پیدا کرنے کا ذریعہ قلم کے بجائے چاقو کی نوک پر رہا۔

بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔جس طرح شریف جواز کی روشنی میں صحیح سمجھتے ہیں۔اسی طرح بدمعاش بھی ان کی دانست میں درست ہوتے ہیں۔

بچپن کی شرارتوں سے نکل کر نوجوانی میں قدم رکھتے ہی زندگی میں کچھ کر دکھانے کا راستہ اور اسے شرافت میں سمجھ میں نہیں آیا۔اس لیے دولت کمانے کا ذریعہ اسے سٹے، جوئے، گانجا چرس کے کاروبار میں دکھائی دیا اور جلد ہی وہ اپنے کاروبار کی دنیا کا بادشاہ بن گیا۔پیسہ بے حساب آنے لگا تو پولس، سماج اور لیڈر سب اس کے اطاعت گزار ہوگئے۔اب شہر میں اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔پولس والے ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوتے۔لیڈر جھک کر ملتے کہ اس کے اشارے پر ہزاروں ووٹ ایک ہی نشان پر پڑتے ہیں۔شہر اور اطراف میں لڑائی جھگڑے ہوتے تو لوگ فریاد لے کر اس کے پاس آتے۔فیصلہ دومنٹ میں ہوجاتا اور اس کی بات دونوں فریق مان لیتے۔جو پہلے آکر اس سے شکایت کرتا اکثر وہ اس کی ہر بات صحیح سمجھتا۔دل کھول کر غریبوں کی مدد کرتا۔رمضان کی ذکات خیرات ہو، کسی غریب لڑکی کی شادی یا مسجد کا چندہ ہو۔کوئی اس کے ٹھیہ سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔اس کی بہادری کے قصے بچوں کو سنائے جاتے مثال دی جاتی کہ موٹا تازہ یا پہلوان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔سینے میں شیر کا جگر چاہئے اور واقعات بھی یہی کہتے تھے۔ایک مرتبہ قریباً دوسوشر پسند لڑکوں کا مجمع بستی پر حملہ آور ہوا۔معاملہ پولس کے کنٹرول سے باہر ہورہا تھا۔یہ اکیلا تلوار لے کر نعرہ لگاتے ہوئے دیوار کود کر ان کے سامنے پہنچا تو سارے مٹی کے شیر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ اپنے بھائی بہنوں اور بیوی بچوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔حقوق العباد کا دل سے قائل تھا۔جوا کھیلنا، گانجا، چرس پینا اس کا معمول اور ہر ماہ ایک لڑکی اس کا شوق تھا۔کوئی چیز زور زبردستی سے حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔دوسرے غنڈوں کی طرح ہوٹل سے بل ادا کیئے بغیر نکل جانا اس کا فخر نہیں تھا۔اگر کوئی مروتاً پیسے نہیں لیتا تو زبردستی دیتا تھا۔

اس کے حواریوں کے سپرد یہ اہم کام دیا گیا تھا کہ وہ لڑکی کو پیسے دے کر سمجھا بجھا کر دوسرے معنی میں گھیر گھار کر لائیں۔اس کام پر کچھ گرگے لگے ہوئے تھے۔

روزانہ ٹھیہ کے سامنے سے جاتی ایک خوبصورت لڑکی

پر اس کی نظر ٹھہر گئی گڑ گے کام پر لگ گئے۔ لڑکی بہت غریب تھی۔ کھانے پینے تک کے پیسے نہیں تھے پڑھنے کا شوق تھا مگر فیس کہاں سے لاتی کسی طرح اسے چکمہ دے کر یہ سمجھا کر کہ صاحب پڑھنے لکھنے کے لیے پیسے دیتے ہیں مگر ان سے شام میں ایک بار مل کر تفصیلات سنانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے آتے ہی حجرے میں بھیج دیا گیا۔ اپنی پسند کا کھانا آدمی بڑے شوق سے کھاتا ہے پھر وہ تو اسے روزانہ سامنے سے جاتا دیکھ کر اسی دن کا منتظر تھا کہ یہ میرے پہلو کی زینت کب بنے گی۔ وہ بہت خوش تھا۔ جیسے ہی وہ حجرے میں داخل ہوا اس کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی وہ قریب جانے لگا یہ ڈر کر دور ہٹ گئی۔ اسے روکتی اور انکار کرتی رہی۔ وہ سمجھا ہر عورت پہلی مرتبہ انکار کرتی ہے۔ انکار اصل میں اقرار کی ابتداء ہے۔ وہ بہت زیادہ جوش میں تھا۔ اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ وہ زار و قطار روئی، چلائی، تلملائی، ہاتھ جوڑ کر گزارش کی اس نے اس کی ایک نہ سنی۔ جیسے ہی اس نے سرکارِ دو عالم کا واسطہ دے کر کہا مجھے چھوڑ دو۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ جوش سرد پڑ گیا وہ اس سے ایسے دور ہٹا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کے جسم پر چادر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔ بازار سے اسے کپڑے اور برقع منگوا کر دیا اور اپنے آدمیوں سے کہا۔ اسے عزت کے ساتھ اس کے گھر چھوڑ کر آؤ اس کی تعلیم مکمل ہونے تک وہ اس کی بیوہ ماں کو ہر ماہ ایک خطیر رقم بھجواتا رہا۔

اس کے بعد سے اس کے نشے کی عادت میں شدت آ گئی۔ اب تک شوق و موج کے لیے پیتا تھا۔ اب جیسے غم میں پی رہا ہو۔ کس کا غم، کاہے کا غم، اس کو حاصل نہ کر سکنے کا غم، اپنے گناہ گار ہونے کا غم یا اپنے کیے پر احساس شرمندگی کا غم۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا تھا۔

اس کے بکی سٹے کی بٹ لیتے۔ چھوٹی سی چھٹی پر لاکھوں کا کاروبار بہت ایمانداری سے ہوتا۔ چیک سے دھوکا ہوسکتا ہے مگر بکی کی چھٹی جس پر ۷۸۶ لکھا ہوتا ہے اس میں کوئی دھوکا نہیں ہوتا۔ وہ ہر چھٹی کا ۷۸۶ پھاڑ کر کھا لیتا۔ پھینکنے نہیں دیتا کہ بسم اللہ کی بے حرمتی ہوگی۔ اس طرح کتنا کاغذ روزانہ اس کے پیٹ میں جاتا اسے خود اندازہ نہیں تھا۔ بہت شان و شوکت، نام و نمود کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔ عزت، دولت، شہرت، عیش و آرام، انسان زندگی میں اور کیا چاہتا ہے۔

ایک دن بہت زیادہ چرس پی کر ٹھیے سے نکلا۔ راستے میں بادل کی گرج بجلی کی چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ کار کی ہیڈ لائیٹ کی روشنی میں اسے کیلنڈر زمین پر پڑا نظر آیا۔ جس پر اللہ لکھا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کا کہا۔ جیسے ہی کار کا دروازہ کھول کر اترنے لگا۔ ڈرائیور نے صاحب بارش ہو رہی ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ وہ اتر کر کیلنڈر اٹھا لایا اور زور زور سے بولنے لگا۔ اللہ کا نام میرے اللہ کا نام، زمین پر پڑا ہے میرا اللہ زمین پر۔ تو تو ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ تیری جگہ تو وہ ہے۔ اب وہ کیلنڈر کو چومنے اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ڈرائیور نے اسے کسی طرح گھر پہنچایا۔ وہ کیلنڈر کو سینے سے لگائے رونے لگا۔ گھر والے سمجھے آج نشہ زیادہ ہوگیا ہے۔ بیوی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس نے کیلنڈر کو احتیاط سے اوپر کے محراب میں رکھا اور لیٹ گیا۔ کروٹ بدل بدل کر رات بھر تڑپتا رہا۔ میرا اللہ زمین پر..........

میرا اللہ زمین.................. میرا اللہ ....اللہ ....اللہ ....صبح آنکھ لگی تو خواب میں اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ ''تیری یہ ادا ہم کو پسند آئی۔ وہ اٹھا اور بڑبڑاتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔ میری ادا پسند آئی کونسی ادا پسند آئی۔ میری ادا کس کو پسند آئی............ کس کو پسند آئی .... کس کو ....ڈاکٹر، حکیم، عامل، جانتا۔ کوئی جواب نہیں دے سکا

پورا کاروبار حواریوں کے نظر ہوگیا۔ وہ اورنگ آباد، دولت آباد، خلدآباد کی ہر درگاہ جاتا۔ سیڑھیوں پر بیٹھا۔ بس ایک ہی کلمہ اس کی زبان پر جاری رہتا۔ میری ادا۔ کونسی ادا، میری ادا کس کو پسند آئی ...... میری ادا کس کو .... کس کو .... لوگ کہتے چرس کی زیادتی سے پاگل ہوگیا ہے۔ زائرین اس کے سامنے پیسے پھینکتے، کوئی کھانا رکھ جاتا۔ وہ کبھی کبھار کھانا کھالیتا۔ پیسے اطراف بیٹھے فقیر لے لیتے۔ بیوی بچوں اور خاندانوں والوں نے پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ ایک درگاہ کی سیڑھیوں سے دوسری درگاہ کی سیڑھیوں تک اس کا ڈیرا تھا۔

مولانا آزاد اسکول کے بچے تعلیمی سیر کے لیے خلدآباد آئے۔ بس سے اتر کر ٹیچرس اور بچے اورنگ زیبؒ کی مزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ٹیچر بچوں کو اورنگ زیبؒ کے بارے میں سمجھا رہی تھی کہ اس پر اس کی نظر پڑی۔ سارا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ پوری طرح قابو میں کر لینے کے بعد بھی اس شخص نے حضورﷺ کا نام لیتے ہی .... وہ اس کے قریب گئی۔ کان لگا کر اس کی بات سنی۔ وہ حسب معمول بڑبڑا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ اپنے آپ میں ہوتے ہوئے کہیں کھوگئی۔ وہ کسی طرح گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ گھر آئی نمازِ عشاء پڑھتے ہی سجدے میں گر کر رونے لگی۔ آج میں تجھے، تیرے محبوب کا واسطہ دے کر اس شخص کے لیے صحت کی بھیک مانگتی ہوں۔ برسوں پہلے میں نے اس شخص کو حضورﷺ کا واسطہ دیا تھا۔ اس نے میری بات مان لی تھی۔ آج میں تجھے اسی کے لیئے تیرے محبوب کا واسطہ دیتی ہوں۔ اے پروردگار عالم، اے دو جہانوں کے مالک، میرے اللہ میری بات سن لے۔ اس نے تیرے محبوب کا نام لیتے ہی .... تو بھی اپنے محبوب کے نام پر .... جانے کیا گیا گڑگڑاتی رہی۔ سجدے سے اٹھی تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اللہ سے کس طرح اس کے لیے دعا مانگے وہ اس وقت اتنا نہیں روتی تھی جتنا آج رو رہی تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ اس شخص نے خواب دیکھا اورنگ زیبؒ کی مزار کی جانب سے کوئی نورانی چہرہ بزرگ اس کے قریب آئے اور کہا ''تیری ادا اللہ کو پسند آئی''۔ جب اس کے دل نے یقین کی مہر لگا دی کہ یہ میرے سرکارﷺ ہی ہیں۔ وہ اٹھا اور وضو کر کے نماز میں جا ملا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ٦

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔ ٨٢

افسانہ

مشتاق احمد وانی

غشی

گلابی بیگم کوئی معمولی خاتون نہیں ہے بلکہ وہ ایک زنانہ کالج کی پرنسپل ہے۔گاڑی خود ڈرائیو کرتی ہے۔ساڑھی پہننے کی شوقین ہے۔نئی نئی رنگین ساڑھیاں پہن کر کالج جاتی ہے تاکہ کالج کے کسی بھی اسٹاف ممبر کو اس میں ادھیڑ عمری کے آثار نظر نہ آنے پائیں۔وہ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پہ لپ اسٹک، کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں، گلے میں ہیرے کا لاکٹ، لمبی گھنیری زلفوں کے بدلے بیوٹی پارلر جاکے بال مشرُوم کٹ کروانا، اونچی ہیل والی چپل پہننا اور عطر کے بدلے اپنے تھل تھل کرتے وجود پہ پرفیوم کا چھڑکاو کیے بغیر وہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی ہے۔وہ سولہ سنگھار کرنے والی عجب مزاج کی خاتون ہے۔پائی پائی کا حساب رکھتی ہے۔بہت زیادہ عجلت پسند اور ہر کسی کی بات پہ فوراً یقین کر لیتی ہے۔اس کے شوہر محترم انقلاب حسین آیورویدک ڈاکٹر ہیں۔وہ بولتے کم ہیں، سوچتے زیادہ ہیں۔سارے گھر پہ گلابی بیگم حکومت کرتی ہے۔اس کے مزاج میں تلخی تو ہے ہی، شوخی بھی ہے۔وہ اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہے۔بڑے بیٹے کا نام عمران ہے۔وہ شادی شدہ ہے، بینک میں ملازم ہے۔چھوٹے بیٹے کا نام خالد ہے وہ انجینئر ہے اور بیٹی کا نام زرّیں ہے وہ نرس کی ٹریننگ کر رہی ہے۔بہت مختصر سی فیملی میں گلابی بیگم کبھی کھلکھلا کے ہنستی ہے، کبھی اس کے چہرے پہ کدورت کے آثار ابھر آتے ہیں اور کبھی اپنے شوہر محترم سے روٹھ جاتی ہے۔اب کے برس اس کے چھوٹے بیٹے خالد کی شادی ایک امیر گھرانے میں ہو رہی ہے۔ایک ماہ کے بعد شادی ہے۔گلابی بیگم کا دل اپنے چھوٹے بیٹے کی شادی کی خوشی میں بلیوں اچھل رہا ہے۔اسے اس بات کی زیادہ خوشی ہو رہی ہے کہ چھوٹی بہو گھر میں بہت سا جہیز لے کر آئے گی۔شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔دعوت نامے اپنے رشتہ داروں اور دوست واحباب کو بھیج دیے گئے ہیں۔رنگین پیلس بُک کروایا گیا ہے۔پڑوس کی عورتیں گلابی بیگم کے گھر پر آکر میگھ ملہار گانے لگی ہیں۔دلہے راجہ کے لیے شادی سوٹ شہر کے سب سے مشہور اور جدید فیشن میں ماہر درزی تیار کر چکا ہے۔دلہن کے لیے قیمتی ملبوسات اور میک اپ کی تمام چیزیں خرید لی گئی ہیں البتہ دلہن کے لیے زیورات کی لسٹ مرصع ساز کو دینا باقی ہے۔لسٹ میں سونے کے کنگن، ہیرے کی دو انگوٹھیاں، سونے کی نتھ، چاندی کی پازیب، سونے کے جھمکے اور پکھراج کا لاکٹ شامل ہے۔

انقلاب حسین کی باتوں سے یوں لگتا ہے کہ ان کے دل کے کسی گوشے میں اسلامی اقدار براجمان ہیں۔ایک دن انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

''گلابی۔۔!مسلم معاشرے میں شادی نام ہے نکاح کا۔سینکڑوں لوگوں کو مدعو کرنا اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنا مجھے یقین ہے یہ میرے نبی ﷺ کی سنت نہیں رہی ہوگی۔ہمیں فضول خرچی اور کفایت شعاری کو ذہن میں رکھ کر چلنا چاہیے۔تُم سروس کے دوران جہاں جہاں رہی ہو ان تمام سہیلیوں اور واقف کار لوگوں کو دعوت نامے بھیج رہی ہو۔میں نہیں چاہتا ہوں کہ فیشن اور رواج کے طور پر نکاح کو غریب و نادار لوگوں کے لیے اتنا کٹھن بنایا جائے کہ وہ شادی ہی نہ کر پائیں''

گلابی بیگم نے اپنے شوہر کی باتیں سنیں تو لمحہ بھر کے لیے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی

''یہ کفایت شعاری اور فضول خرچی کا بھوت آپ پہ کہاں سے سوار ہوا؟ میرے بیٹے خالد کی شادی روز روز تھوڑی ہونی ہے۔نکاح اپنی جگہ اور خوشی اپنی جگہ۔میں خالد کی شادی بڑی دھوم دھام اور فرخ دلی سے کرنا چاہتی ہوں''

انقلاب حسین کو اپنی بیوی کی باتیں سن کر پشیمانی سی محسوس ہوئی،ان سے چپ نہیں رہا گیا۔کہنے لگے

''گلابی۔۔!میری بات دھیان سے سنو،تم جتنے بھی لوگوں کو بیٹے کی شادی پر مدعو کر رہی ہو وہ سب دھن دولت کے مالک اور اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔تمھاری تیار کردہ لسٹ میں مجھے ایک بھی غریب ومسکین اور نادار آدمی نظر نہیں آ رہا ہے۔آخران کا بھی تو ہم پر کچھ حق ہے''

گلابی بیگم نے جواب دیا

''آپ کی نظر میں اگر کوئی مفلس ونادار آدمی ہے تو اسے بلا لیجیے۔میں کہاں منع کر رہی ہوں'' گلابی بیگم تیار ہو کر کالج جانے کے لیے گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والی تھی کہ انقلاب حسین نے کہا

''ہاں ٹھیک ہے،میں ایک تو باہر سامنے مین روڈ پہ بیٹھے کوڑھی کو کھانا کھلانا چاہتا ہوں،دوسرے ہمارے محلے میں ایک بیوہ رہتی ہے اس کی چار کم سن بیٹیاں ہیں چاروں گونگی ہیں انھیں دعوت دینا چاہتا ہوں''

گلابی بیگم اپنے شوہر کی باتیں سن کر ایک بار پھر بدکی۔جھٹ سے بول اُٹھی

''اب کیا کوڑھی اور گونگے لوگ ہی رہے ہیں جن کی آپ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ذرا دماغ صحیح رکھیں۔آپ ایک آیورویدک ڈاکٹر ہیں۔آپ کو اس طرح کی معمولی بلکہ گھٹیا باتیں سوچنا اور بولنا زیبا نہیں دیتا ہے۔یہ کہتے ہوئے وہ کالج چلی گئی۔ادھر انقلاب حسین ایک بار پھر رنجیدہ سے ہو کر رہ گئے۔ان کی نظروں نے دور تک بیوی کی گاڑی کا تعاقب کیا،پھر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں آ کے بیٹھ گئے۔

گلابی بیگم جونہی کالج پہنچی تو اس کے تمام اسٹاف ممبران،چپراسی اور بابوٗقسم کے لوگ سہمے ہوئے اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔سب نے اپنے موبائل جیب میں رکھنے شروع کیے مگر گلابی بیگم نے انھیں دیکھ لیا،پھر وہ ایک مخصوص رعونت بھری ادا کے ساتھ اپنے آفس میں داخل ہوئی۔لال رنگ کا پرس ایک طرف رکھا اور اونچی نرم موونگ چیر پر بیٹھ گئی۔اس نے ٹیبل بیل بجائی تو چپراسی فوراً آ کے اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔گلابی بیگم نے اسے چائے اور پانی پلانے کو کہا۔کچھ ہی وقت کے بعد جب چپراسی چائے پانی لے کر پرنسپل آفس میں داخل ہوا تو گلابی بیگم نے اسے کہا

''سنسار۔۔!جا کے تمام اسٹاف ممبران کو کہہ دو کہ ایک بجے میرے آفس میں میٹنگ ہوگی'' چپراسی نے تمام اسٹاف ممبران کو میٹنگ میں حاضر رہنے کو کہہ دیا۔

ایک بجے کے قریب تمام اسٹاف ممبران پرنسپل آفس میں کرسیوں پر بیٹھنے لگے۔جب سبھی آ گئے تو گلابی بیگم ان سے مخاطب ہوئی،کہنے لگی

''میں چند دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ ہمارے کالج کے اسٹاف ممبران ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ دونوں زیادہ تر موبائل فون پہ لگے رہتے ہیں۔کوئی کسی سے باتیں کر رہا ہوتا ہے اور کوئی فیسبک میں کھویا ہوتا ہے۔ظاہر ہے ہمارے نوجوان طالب علموں پہ اس کا کیا اثر پڑے گا یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔لہٰذا یہ سلسلہ بند کر دیجیے''

گلابی بیگم کی باتیں سُن کر تمام اسٹاف ممبران کے چہروں پہ ندامت کے آثار ابھر آئے۔علم نفسیات کے پروفیسر اخلاق احمد نے ہمت جتاتے ہوئے پوچھا

''میڈم۔۔! کیا اگر کسی کا فون آئے تو اٹھانا منع ہے؟''

''ہاں بالکل منع ہے۔اگر آپ کلاس میں لیکچر دے رہے ہوں تو فون نہیں اٹھائیے''

میٹنگ تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی ۔بہت سے مسائل زیر بحث لائے گئے ۔بلآخر چائے کے ایک ایک کپ پر یہ میٹنگ برخاست ہوگئی ۔گلابی بیگم اٹھی اس نے اپنا لال پرس اٹھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئی ۔جونہی اس نے سیٹ بیلٹ باندھی تو اس کا فون بج اُٹھا۔اس نے فون اٹھایا بغیر نام کے کسی کا نمبر تھا۔گلابی بیگم نے ہیلو کہا تو آگے سے مردانہ آواز اس کے کان میں پڑی،اس نے کہا

''میڈم۔۔!میں بھارتیہ اسٹیٹ بینک کا جنرل منیجر بول رہا ہوں ۔آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کا اے ٹی ایم کارڈ بلاک ہو چکا ہے ۔اسے فوراً کھلوایئے ،ورنہ آپ اپنے اے ٹی ایم کارڈ سے ایک روپیہ بھی بینک سے نہیں نکال سکیں گی''

گلابی بیگم ،بھارتیہ اسٹیٹ بینک کے جنرل منیجر کی باتیں سُن کر تشویش میں پڑ گئی ،فوراًپوچھنے لگی

''تو بتایئے مجھے کیا کرنا ہے تاکہ میرا اے ٹی ایم کارڈ چالو ہو جائے''

میڈم۔۔! آپ کو ایک تو اپنا اے ٹی ایم کارڈ کا نمبر بتانا ہے کوڈ کے ساتھ اور دوسرا اپنا بینک اکاونٹ نمبر بتایئے ۔جلدی بتایئے ورنہ ایک گھنٹے کے بعد ہمارا آفس بند ہو جائے گا''

گلابی بیگم نے کہا

''جی ابھی لکھواتی ہوں''

اس نے جنرل منیجر کو اپنا اے ٹی ایم کارڈ نمبر،اس کا کوڈ، بینک اکاونٹ نمبر اور آدھار کارڈ کا نمبر تک لکھوانے کے بعد بڑی بے تابی سے کہا

''سر۔۔! پلیز میرا اے ٹی ایم کارڈ چالو کروا دیجیے ۔ویسے کب تک چالو ہو جائے گا؟''

میڈم ! آپ فکر نہ کیجیے ،کل دو بجے تک آپ کا اے ٹی ایم کارڈ ایکٹیویٹ ہو جائے گا، یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ آج کل سب کچھ آن لائن ہو رہا ہے''

گلابی بیگم کو جنرل منیجر کی باتیں سُن کر تھوڑا سا اطمینان ہوا ۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر چلی آئی ۔اپنے گھر آنگن میں ہر چیز کو سلیقے سے رکھا ہوا دیکھ کر وہ بہو پہ بہت خوش ہوئی ۔بہو نے آتے ہی اسے شربت پلائی ۔انقلاب حسین ایک الگ کمرے میں مریضوں کے مرض کی تشخیص کرنے میں مصروف تھے اور خالد اپنی بہن زرّیں کے ساتھ لان میں بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔

رات کو گلابی بیگم اپنے شوہر محترم ،بہو، بیٹوں اور بیٹی کے ساتھ ہنسی مزاق کی باتیں کرتی رہی پھر اس نے انقلاب حسین کو یاددلاتے ہوئے کہا

''ہاں مجھے یاد آیا کل دلہن کے گہنے تیار کروانے سُنار کے پاس جانا ہے۔ میں کل کالج سے واپس آنے کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گی''

انقلاب حسین بولے

''میری رائے یہ ہے کہ کل تم کالج نہیں جاو کیونکہ شدت کی گرمی پڑ رہی ہے ۔دو بجے کے بعد گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے ۔پسینے سے سارا بدن شرابور ہو جاتا ہے۔کل صبح دس بجے سُنار کے پاس جائیں گے''

''نہیں نہیں،کل مجھے ہر حال میں کالج جانا ہے ۔میرے ٹیبل پہ بہت سی اہم فائلیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ان پہ دستخط کروں گی۔ڈائریکٹر آف کالجز کا فون کل بھی آیا تھا''

باتوں باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے ۔اب سب پہ نیند غالب آ رہی تھی کہ اسی دوران ایک کُتا آ کے گھر کے باہر اپنی

تھوتھنی آسمان کی جانب اٹھائے زور زور سے نحوست بھری بکسُری آواز میں رونے لگا۔گلابی بیگم کو اس کُتّے کی آواز انتہائی بدشگون معلوم ہوئی۔اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو باہر بھیجا اور کُتّے کو بھگا دیا ۔

دوسرے دن جب گلابی بیگم ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد پوری طرح سج سنور کر کالج جانے کے لیے تیار ہوگئی اور گاڑی کی چابی لے کر باہر آنے لگی تو اسی اثنا میں اسے یکے بعد دیگرے اپنے موبائل فون پہ میسیج آنے لگے۔اس نے جونہی میسیج پڑھا تو اس کے بینک اکاونٹ میں سے ایک لاکھ اسّی ہزار روپے غائب تھے۔وہ دیکھتے ہی زور سے چیخ پڑی۔اس کی چیخ سن کر اس کے شوہر انقلاب حسین،اس کے دونوں بیٹے،بیٹی اور بہو اندر سے باہر دوڑ پڑے۔اس پہ غشی طاری ہو چکی تھی۔بیٹی نے روتے ہوئے پوچھا

''امّاں۔۔!کیا بات ہوگئی۔۔آپ کو کیا ہوا؟''

سبھی گھبرائے ہوئے تھے۔بہو نے پیر تلسنے شروع کیے اور بیٹی نے ہاتھ۔انقلاب حسین اور دونوں بیٹوں نے گلابی بیگم کو ہاتھوں پہ اٹھایا اور اندر بستر پہ رکھ دیا،پھر بیٹی کچن کی طرف دوڑی ،روح افزا شربت کا ایک گلاس لے کر ماں کو پلایا۔گلابی بیگم نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں،بڑے بیٹے نے پوچھا

''امّاں۔۔!کیا ہوا آپ کو؟۔۔بات کیا ہے؟''

گلابی بیگم نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا

''بیٹا۔۔!میں۔۔لُٹ گئی۔۔کسی لُٹیرے۔۔کے دھوکے۔۔میں آ گئی ہوں!کل۔۔کالج سے۔۔نکلتے ہوئے کسی کا۔۔۔فون آیا تھا ۔وہ کہہ رہا تھا کہ۔۔آپ کا اے ٹی ایم کارڈ۔۔بلاک ہوگیا ہے۔اسے۔۔چالو کروانے کے لیے۔۔۔اپنا اے ٹی ایم کارڈ نمبر اور کوڈ بتا دیں۔میں نے۔۔اسے سب کچھ۔۔بتا دیا تھا۔اب موبائل پہ میسیج پڑھا۔۔تو ایک لاکھ اسّی ہزار روپے میرے اکاونٹ سے غائب ہیں!!!ہائے اسے کیڑے پڑیں!۔۔وہ بُری موت مرجائے!''

سبھی افراد گلابی بیگم کی باتیں سُن کر ہکّا بکّا رہ گئے۔سب پر حیرت اور غم وغصے کی حالت طاری تھی۔انقلاب حسین نے بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا

''اری!دل چھوٹا نہ کرو،گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔پیسہ ہاتھ کی میل ہوتا ہے۔اللہ اور دے گا''

بیٹی نے بھی ماں کی ہمت بندھانے کے لیے کہا

''امّاں۔۔۔!جان ہے تو جہان ہے۔پیسہ آنی جانی چیز ہے،ہمت وحوصلے سے کام لیں''لیکن گلابی بیگم ہمت وحوصلہ کھو رہی تھی۔اس نے ڈوبتی ابھرتی ہوئی آواز میں کہا

''میرے وجود میں بے ہوشی بڑھ رہی ہے۔میں اس حال میں کالج نہیں جا پاؤں گی،البتہ مجھے اسپتال لے چلو!''

☆☆☆

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

شاہد حسین زبیری

خاکہ

وضع داری اور قدامت پسندی۔۔نواب عباس یار جنگ

پولیس ایکشن سے پہلے کی تو کوئی بات یاد نہیں البتہ سقوطِ حیدرآباد کے چند سال بعد کی بہت سی باتیں آج بھی ذہن میں تازہ ہیں۔ کسی بزرگ کو کہتے سنا تھا کہ حیدرآبادی تہذیب میں کھلے سر گھر کے باہر نکلنا نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شاید اس بیان کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے مبالغہ آمیز انداز میں فرمایا یہاں بعض ایسے بھی اشخاص گزرے ہیں جنہیں نائی نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا۔ ہم نے بڑے تعجب سے استفسار کیا، آخر اصلاح کیسے کروائی جاتی تھی تو مسکرا کر فرمایا ''دائیں طرف کے بال تراشنے کے لیے ٹوپی کو بائیں طرف جھکا دیا جاتا اور بائیں طرف کے بال تراشنے کے لیے ٹوپی کا رخ دائیں طرف ہو جاتا اور یہی عمل سامنے اور پچھلے بالوں کی تراش میں روا رکھتے۔'' ہماری نظر سے تو آج تک اس قماش کا کوئی شخص نہیں گزرا مگر ہم نے بھی بیشتر لوگوں کو گھر کے باہر ٹوپی اوڑھے ضرور دیکھا ہے، لیکن یہ کہنا ممکن نہیں کہ ان لوگوں کو ہمیشہ ہی ٹوپی میں دیکھا ہو۔ بجز ایک شخص کے جسے ہم نے بغیر ٹوپی کے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک بار شاید ہمیں یہ موقع ضرور مل جاتا مگر اس شخص کی پھرتی کی بدولت وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ میرا روئے سخن نواب عباس یار جنگ سے ہے۔

اگر میرا یہ اظہار کسی ایسے شخص کے تعلق سے ہوتا جس سے میری ملاقات گاہے ماہے ہوا کرتی تو بات قرینِ قیاس بھی تھی مگر بات کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ میرا ملنا جلنا موصوف سے کئی دہوں تک رہا اور موصوف کے گھر آنا جانا بھی وقت بے وقت ہوا کرتا کیوں کہ آپ کے بڑے صاحبزادے نواب احترام علی خاں مہدی میرے قریبی دوست ہیں۔ جب یہ لوگ حیدرگوڑہ سے ٹولی چوکی منتقل ہوئے تو اُس زمانے میں ٹولی چوکی محض ایک جنگل ہوا کرتا تھا اور اُس علاقے کا پہلا رہائشی مکان نواب عباس یار جنگ کا ہے۔ دوسرا یوسف ٹیکری جس میں نواب یوسف الدین کا خاندان رہائش پذیر تھا اور تیسرا مکان جس میں، میں رہا کرتا تھا۔ یعنی ''سبزہ'' جو آج سبزہ کالونی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چوں کہ مہدی بھائی سے میرے قریبی روابط تھے لہٰذا آتے جاتے جب بھی موقع ملتا میں ان کے پاس رک جاتا۔ اس زمانے کے ساکنانِ ٹولی چوکی غیر متوقع مہمانوں کی توقع نہیں رکھتے تھے، کیوں کہ اُس دور میں یہ علاقہ کافی دور دراز کا سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کوئی بھی آنے والا فون پر وقت لیے بغیر نہ آتا۔

ایک دن جب میری گاڑی نواب عباس یار جنگ بہادر کے پھاٹک کے احاطہ میں داخل ہوئی تو میں نے کسی شخص کو نہایت برق رفتاری سے گھر کی طرف دوڑتے دیکھا۔ جس کی وجہ سے میں پہچان نہ سکا کہ یہ شخص کون ہے بعد میں پتہ چلا کہ مرحوم اپنے نواسے کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے اور جیسے ہی اُن کی نظر گھر میں آنے والی گاڑی پر پڑی تو تیزی سے اندر چلے گئے۔ کیوں کہ انھیں یہ احساس تھا، کہ وہ کھلے سر ہیں۔

آپ کے گھر میں باہر کے برآمدے کے پیچھے زینہ ہے جس کے دائیں اور بائیں دیوان خانے اور کھانے کا کمرہ اور داخلی دروازے کے مقابل ایک اور دروازہ جو نواب صاحب کے رہائشی حصہ کی طرف کھلتا ہے۔ ٹیلی فون اسی دروازے سے متصل سیڑھیوں کے نیچے ہوا کرتا۔ چونکہ مہدی بھائی کی رہائش اوپری منزل پر تھی اس لیے ہمیں اسی زینہ کو طئے کرنا پڑتا اور ہم جب بھی ان کے ہاں

گئے ہم نے اکثر نواب صاحب کو ٹیلی فون پر مصروف پایا وقت کچھ بھی ہوا ہو، نواب صاحب گلے تک بند شروانی پہنے ترکی ٹوپی میں ہی نظر آتے۔

موصوف، نواب تراب یار جنگ کے صاحبزادے، بہرام الدولہ کے نبیرے، سالار جنگ اولیٰ کے پڑنواسے، اور فخر الملک کے نواسے تھے۔ آپ کی بیگم نواب اصغر نواز جنگ کی دختر اور شہاب جنگ کی پوتی تھیں۔ خاندان کے اس پس منظر کو جاننے کے بعد یہ تو ایک نابینا بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شخص کا بچپن اور جوانی کس ناز و نعم، عیش و عشرت میں کٹے ہونگے۔ یہ چیزیں کسی بھی شخص میں برائیاں پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں مگر اس کے برخلاف ہم کو مرحوم میں بجز اچھائیوں اور خوبیوں کے کچھ اور نظر نہیں آیا۔ جناب والا کو انگریزی اور اُردو پر کامل عبور تھا۔ بہت اچھے شعر کہتے، فی البدیہہ اور مسجع شعر کہنے پر آپ کو مہارت حاصل تھی۔ گفتگو ایسی دلکش اور دلفریب ہوتی کہ جو شخص آپ سے ملتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ فطری طور پر بے لوث، بے ریا اور بے نیاز تھے۔ انتہائی خوش باش، ہنس مکھ، تہذیب کا یہ عالم کہ بے ساختہ ہنسی میں اکثر اپنا منہ رومال سے ڈھانک لیتے تاکہ کھلا منہ نظر نہ آئے۔

دورانِ طالب علمی بہت اچھے اسپورٹس مین رہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم جاگیردار کالج (جو آج پبلک اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے) میں ہوئی اور آپ کرکٹ، فٹبال، ہاکی، سوئمنگ، رائیڈنگ، باکسنگ کے کپتان رہے۔ بلیرڈ اور شکار ایک عرصے تک موصوف کا پسندیدہ مشغلہ رہا۔

جناب والا کی جن دو خصوصیات سے میں ذاتی طور پر بہت زیادہ متاثر رہا، وہ ان کا مذہبی رجحان اور ان کی اپنے والد کے تئیں سعادت مندی۔ مذہبی رجحان کا یہ حال تھا کہ نماز کا خطا ہونا تو درکنار آپ کی نمازیں عام طور پہ قضا بھی نہ ہوتیں۔ کوئی دن بغیر تلاوت کے نہ گزرتا اور آپ کی سب سے اہم خوبی یہ تھی کہ عملی زندگی میں آپ کا ہر عمل مومنانہ رہا۔ جو لوگ نواب تراب یار جنگ سے واقف ہیں، انھیں اس بات کا یقینی طور پر اندازہ ہوگا کہ مرحوم نہایت ہی نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ نتیجتاً خلافِ مرضی کچھ بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ نواب عباس یار جنگ چوں کہ نواب تراب یار جنگ کی واحد نرینہ اولاد تھے لہٰذا دونوں کا وقت کچھ زیادہ ہی ساتھ گزرتا۔ گو نواب تراب یار جنگ اپنے صاحبزادے کو بہت ٹوٹ کر چاہتے مگر اُن کے مزاج کو گوارا کرنا نواب عباس یار جنگ کا ہی حوصلہ تھا جسے وہ نہایت خندہ پیشانی اور سعادت مندی سے روا رکھتے۔

چلیے آخر میں دو دلچسپ واقعات بھی لکھتا چلوں۔ ایک واقعہ ان سے سُنا ہوا ہے اور دوسرا موصوف کی فطرت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو سنانے سے پہلے بڑے کرب اور بے چینی سے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے فرمایا کرتے، ''شاہد حسین صاحب، وقت نے زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا اور خاص طور سے تہذیب کے منہ پر تو ایسا کھینچ کر طمانچہ رسید کیا کہ ہر صورت بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خود اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو کر رہ گئے۔ میں آپ کو یہاں کے آداب و تہذیب کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ جاگیردار کالج میں طلبہ کے Grand Parents کے لیے walking race ہوا کرتی، جس میں ایک بار بزرگ شخصیات میں نواب فخر الملک بہادر، اور مہاراج کشن پرشاد بہادر دونوں حضرات نے حصّہ لیا۔ لہٰذا اس ریس کے شروع سے اختتام تک تمام شرکاء ان دونوں کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ کسی نے ان دونوں سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی۔ نتیجتاً ریس ان دونوں ہی کے درمیان رہی، کبھی نواب صاحب آگے نکلنے لگتے تو سلام کرتے ہوئے فرماتے معافی چاہتا ہوں مہاراج بہادر، اور آگے نکلنے پر ترچھا چلتے تاکہ

مہاراج بہادر سے پیٹھ نہ ہو اور اسی آداب وتہذیب کا مظاہرہ مہاراج بہادر بھی فرماتے۔ آخر کار مہاراج بہادر جو آگے نکل چکے تھے جیت کے نشان سے پہلے رک کر نواب صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ نتیجتاً ریس برابری پر ختم ہوئی۔

دوسرا واقعہ جو ان کی فطرت سے متعلق ہے وہ یہ کہ انتقال سے چند برس قبل کافی اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی اُن سے بات کرتا اور جسے موصوف ٹھیک سے سن نہ پاتے تو کبھی یہ نہ کہتے کہ میری سماعت کمزور ہوگئی ہے بلکہ فرماتے ''مکرر فرمائیں۔ میں صاف سن نہ سکا۔ کچھ دنوں سے نزلہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے کان بند ہیں صاف سنائی نہیں دے رہا۔'' یہ جملہ ہم قریب ایک دہے تک سنتے رہے اور ہمیں ہمیشہ مرحوم کے اس جملے پر غالب کا یہ شعر یاد آجاتا۔

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

(بعد از مرگ لکھا گیا)

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگارنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر' پروفیسر گوپی چند نارنگ' خواجہ حسن ثانی نظامی' مشفق خواجہ' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر' انتظار حسین' پروفیسر شمیم حنفی' فکر تونسوی' پروفیسر نثار احمد فاروقی' ڈاکٹر شہریار' یوسف ناظم' مرزا ظفر الحسن' پروفیسر یوسف سرمست' رفعت سروش' پروفیسر بیگ احساس' دلیپ سنگھ' نریندر لوتھر' علی باقر' کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو 'جیسا دیکھا جیسا پایا' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ' محمد علی صدیقی' علی باقر' عارف حسینی' بلراج ورما اور تقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور' شمس الرحمٰن فاروقی' صدیق الرحمٰن قدوائی' ڈاکٹر قمر رئیس' جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی' پروفیسر مغنی تبسم' ڈاکٹر عتیق اللہ' ڈاکٹر مصطفیٰ کمال' رضیہ فصیح احمد' مصحف اقبال توصیفی' ڈاکٹر اشفاق احمد ورک' علی ظہیر' حسن چشتی' ڈاکٹر افسر کاظمی' زاہد علی خاں' من موہن تلخ' انور سدید' مخمور سعیدی' ڈاکٹر مظفر حنفی' علیم صبا نویدی' قمر علی عباسی' مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی' کمار پاشی' رشید انصاری' حامد اکمل' طاہر مسعود' فیروز عالم' حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ' کوچہ پنڈت' لال کنواں' دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مضمون

نور الحسنین

بنارس والی گلی

فیاض رفعت اُردو کے ایک ایسے بے نیاز قلم کار ہیں جو کبھی شہرتوں کے تعاقب میں ناقدینِ ادب کی بارگاہوں میں نہ جھکے نہ سمجھوتے کیا۔ حالانکہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، تنقید بھی لکھتے ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ اُن کا بے تکلف حلقۂ احباب نہایت وسیع ہے۔ جس میں شاعر، ادیب، نقاد اور تعلیم یافتہ قاری بھی ہیں۔ وہ جس سے بھی ایک بار ملتے ہیں پھر اُسے کبھی نہیں بھولتے۔ وہ محفلوں کے آدمی ہیں۔ مزاجاً بذلہ سنج، بے باک، بامروت اور اُکھڑ انسان ہیں۔

فیاض رفعت ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ اب تک اُن کے تین افسانوی مجموعے 'میرے حصے کا زہر'، 'نئے عہد نامے کی سوغات' اور 'جہانِ دیگر' ایک شعری مجموعہ 'بیتی رتوں کا منظر نامہ' ایک تنقیدی کتاب 'نقدِ آگہی' علیگڑھ کی یادوں پر مشتمل کتاب 'زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی' دو کتابیں مرتب کیں 'اندرا گاندھی' اور 'دِلّی جو ایک شہر تھا' ریڈیو کی ملازمت میں جن اہم شخصیات سے اُنھوں نے انٹرویوز کیا تھا اُس پر مبنی کتاب 'زندہ اپنی باتوں میں' اور اُن کا تحقیقی مقالہ بعنوان 'اُردو افسانے کا پس منظر' شائع ہو چکے ہیں۔

اس وسیع ادبی سرمائے کو اپنے قارئین کے حوالے کرنے کے بعد فیاض رفعت ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی پہلی ناول ''بنارس والی گلی'' کی اشاعت کے ساتھ ہی شہرت اور مقبولیت کی اُس صف میں شامل ہو گئے جس کی تمنا تو ہر ادیب کرتا ہے لیکن یہ کج ادا نازنین ہر کسی کو اپنی جلوہ سامانیوں سے سرشار نہیں کرتی۔

'بنارس والی گلی' اُن کی سوانحی ناول ہے لیکن یہ فیاض رفعت کا کمال ہے کہ اُنھوں نے کہیں بھی ناول کے فن کو مجروح نہیں کیا۔ ناول کا اسلوب، عمدہ کردار نگاری، تیز تر منظر نامہ، دلچسپ اندازِ بیان، زندگی کے کھٹے میٹھے تجربات، واقعات کی ندرت اور حادثات و اتفاقات نے ناول کے مطالعاتی وصف میں چار چاند لگا دیئے ہیں اور قاری بے تھکان پورا ناول پڑھ جاتا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی اس کا بیانیہ اور زبان کا خوب صورت استعمال ہے۔ جسے قاری ہر صفحے پر کچھ لمحے ٹھہر کر فیاض رفعت کی ستائش کرتا ہے۔ ناول فیاض رفعت کی مکمل سوانح نہیں ہے بلکہ اس کا مرکزی کردار 'بادشاہ خان' (جو اس ناول کا راوی بھی ہے) اُن کی حیات کے مختلف گوشوں پر سے پردے اُٹھاتا ہے:

ناول کا پس منظر علی گڑھ، دہلی، سہسوان، جھارکھنڈ، کلکتہ، بنارس اور ممبئی پر پھیلا ہوا ہے۔ فیاض رفعت نے ان شہروں کے ماضی حال اور کرداروں کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی کہ قاری بھی اپنے آپ کو اُن کے ساتھ بلکہ اُس ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

ناول کا آغاز نراڈ کاسٹنگ ہاؤس کے آفیس سے ہوتا ہے جہاں بادشاہ خان کے سامنے اُس کے دل کی وہ پہلی دھڑکن سامنے ہوتی ہے جیسے بیس برس پہلے وہ علی گڑھ کے رائل ہوٹل کے بالا خانے پر چھوڑ آیا تھا۔ زندگی کے مختلف تجربات سے گزرتا ہوا وہ ان آل انڈیا ریڈیو پر اسٹیشن ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

> '' اُس دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی چھ منزلہ عمارت کے پہلے مالے پر اُسے اپنے روبرو دیکھ کر حیرت سے میں بھی بت بنا رہ گیا۔ چہرہ جانا پہچانا تھا۔ برسوں کی دھند نے شناخت کو اِک ذرا مشکل بنا دیا تھا۔ سانولی سلونی رنگت والی مضبوط بدن کی عورت خاصی پُرکشش تھی۔

گو جسم فربہی کی طرف مائل تھا، مگر قوسوں کے نمایاں ہو جانے کی بنا پر وہ کمان پر چڑھا ہوا ایسا تیر تھی جو بڑے بڑوں کی ریاضت کو آج بھی خاک میں ملا سکتی تھی۔ میز پر سجے گلدان کے باسی پھولوں میں خوشبو باقی تھی۔ اپنی دھواں دھواں آنکھوں سے وہ مجھے حیرت سے تکا کی، ماضی کی راکھ کے الاؤ میں دبی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح روشن ہو گئیں اور ایک پوری دنیا ۔۔۔ پوری کائنات میری آنکھوں کی محرابوں پر انگڑائی لے کر جاگ اُٹھی۔ بیتے وقت کا ایک ایک لمحہ اپنی تمام تر سرشاریوں کے ساتھ میرے تھکے ہوئے وجود کو سہلانے اور گدگدانے لگا کہ زندگی کی اس ہزار شیوہ داستان کا شہریار بھی میں ہوں اور شہزاد بھی۔'' (۱)

یادیں شہر علی گڑھ میں اپنی آنکھیں کھولتی ہیں۔ ملک کی آزادی سے پہلے کا ماحول ہے۔ سرکاری ملازموں کی تانا شاہی خصوصاً پولس والوں کا رعب داب، شرفاء کی زندگیوں کی عکاسی، کنجڑے غنڈوں اور گانے والی طوائفوں کے کوٹھے، یونیورسٹی کے لڑکوں کی دادا گیری اور اُن کے شب و روز اسی ماحول میں ناول نگار بادشاہ خان کے بچپن، جوانی اور گھریلو حالات پر سے پردہ اُٹھاتا ہے:

'' بیس برس بیتے ۔۔۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی میں بی۔ اے پارٹ ون کا طالب علم تھا۔ ابّا جی انگریزوں کے زمانے کے تھانیدار تھے۔ گھر میں ہر طرح کی فراغت تھی۔ آزادی تو آئی تھی مگر پولیس کا دبدبہ قائم تھا۔ ابرو کے اشارے پر گردنیں جھکتی تھیں۔ رعب داب کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگ سینما دیکھنے جاتے تو پوری بالکونی ریزرو ہوتی۔ اسکول جانے کے لیے تانگہ گھر آتا تھا۔ ٹیوشن دینے وائس پرنسپل گھر آتے۔ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں کی آنکھ کا تارا تھا۔ کھانے پینے کی ریل پیل تھی۔ خوب اچھی کاٹھی نکالی۔ پورے قد کا نوخیز نوجوان تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں یونیورسٹی میں پڑھائی تو برائے نام کرتے تھے۔ غیر نصابی مشاغل میں دلچسپی زیادہ تھی۔ بیشتر وقت یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں گزرتا۔ جسم میں دو دانے تھے۔ ہیکڑی اور دادا گیری کی عادت پڑ گئی۔ اسٹوڈنٹس یونین کی سیاست میں دخل در معقولات کرنے لگا۔ آئے دن کی مار پیٹ، جھگڑے ٹنٹے اور فضیحت سے ابّا تنگ آ گئے تھے۔ کئی بار یونیورسٹی سے نکالے جانے کی نوبت آئی، مگر اثر و رسوخ کی بنا پر بات ٹلتی گئی، ہاں جرمانہ ضرور ہوتا رہا۔'' (۲)

ناول علی گڑھ کے گلی کوچوں، شاہراؤں، دکانوں اور وہاں کے ماحول اور اُن افراد سے متعارف کرواتا ہے جو طوائفوں کے کوٹھے چلاتے ہیں۔ اُن لوگوں سے بھی ملاتا ہے جو اُن کوٹھوں پر گائیکی سننے آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے وہ طالب علم بھی وہاں پہنچتے ہیں جو اپنی تعلیم سے بے نیاز ہیں اور اپنا وقت اور پیسہ وہاں لٹاتے ہیں۔ بادشاہ خان بھی اُن بگڑے ہوئے طالب علموں کی صحبت میں رہتے ہوئے شراب بھی پینے لگتا ہے۔ دادا گیری کرتا ہے۔ ہر روز ایک نیا فتنہ اُٹھاتا ہے۔ فیاض رفعت نہایت باریک بینی سے بلکہ تمام تر جزئیات کے ساتھ ایک ایک منظر قلم بند کرتے ہیں۔ اب ذرا طوائف کے اس کوٹھے کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

’’ کمرہ کافی طویل وعریض تھا۔سفید براق چاندنی بچھی ہوئی تھیں ۔سلیقے کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔موتیا بیلا کے پھولوں کی خوشبو فضاء میں پھیلی ہوئی تھی ۔سارنگی پر ایک بزرگ صورت آدمی بیٹھا سُر ملا رہا تھا ۔ ہارمیونیم طبلے پر دو مراثی بیٹھے ہوئے کوئی فلمی دھن نکال رہے تھے۔اُن کے آگے ایک شہابی رنگت والی عورت کسبی بنی بیٹھی تھی ۔اُس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی معصومیت تھی ۔ گو وہ مسکرا رہی تھی مگر اُس کی مسکراہٹ میں مونا لیزا کا حزن و ملال چھپا ہوا تھا۔اُس کے پہلو سے لگی ایک نوخیز شوخ وشنگ سنولائی رنگت کی لڑکی بیٹھی ہوئی بات بات پر ہنس رہی تھی ۔وہ تین تماش بین بیٹھے ہوئے تھے۔اُن میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ذات کا کنجڑا تھا اور پھلوں کی منڈی میں اُس کا بڑا کاروبار تھا۔اس کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کے بنئے گاؤ تکیے کا سہارا لیے آرام سے فروکش تھے ۔ بعد میں پتہ چلا ان میں ایک کا نام تارا چند ہے جو تالوں کی ایجنٹی کرتا ہے اور دوسرے مہاشے کیلاش جی ہیں جو رائل تھیٹر کے مالک ہیں ۔ اور رنڈیوں کے پرانے سرپرست بھی ۔صبح سے شام اور شام سے رات تک رنڈیوں کے بالا خانوں میں ڈیرا جمائے رہتے ہیں۔‘‘ (۳)

اسی کوٹھے پر بادشاہ خان کا دل نسرین میں اٹک جاتا ہے ۔وہ شوخ چنچل حسینہ بھی اپنا دل اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے ۔بادشاہ خان کی آمد اُس کوٹھے پر زیادہ ہو جاتی ہے ۔ طوائفوں سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ کھاتے پیتے گھروں کے لڑکوں کو اپنی زلفوں کا اسیر بنا لیتی ہے اور اُن سے مال و دولت اینٹھتی ہے۔لیکن ایک دن نسرین کے ساتھ والی طوائف چھمنا اُسے سمجھاتی ہے کہ وہ طوائفوں کے کوٹھوں پر آنا جانا بند کر دے اور اپنا دھیان پڑھائی میں لگائے ۔مٹھو بھڑوا جو اُن دونوں لڑکیوں کا باپ ہے وہ بادشاہ خان سے کہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو گانا سننے تک ہی محدود کرلے کیونکہ طوائفیں گھر نہیں بساتیں،اور نا ہی ہم لوگ اُنھیں ایسا کرنے دیتے ہیں کیونکہ اگر طوائفیں ایسا کرنے لگیں تو ہم لوگ بھوکے مارے جائیں گے۔

فیاض رفعت نے علی گڑھ کی گنگا جمنی تہذیب کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے ۔یہ نقشہ بناوٹی نہیں ہے ، بلکہ لوگوں کے دلوں میں سچی محبت کا سمندر ٹھاٹیں مارتا تھا۔ ہندو مسلمان اور شیعہ شیر و شکر کی مانند رہتے تھے محرم اور تیج تہوار مل جل کر مناتے تھے۔ایک دوسرے کی گھر آنا جانا تھا اور دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے۔اُس دور کے شعراء جن میں ابرار حسنی گنوری ، مختار ہاشمی ، جمنا پرشاد راہی ، نازش انصاری، عرشی منّا اور شہباز جاوید شفق علی گڑھ میں پہنچ جاتے ۔مشاعرے ہوتے محفلیں جمتی تھیں ۔رویندر جین کے والد اندرمنی جین اپنے وقت کے نہایت مشہور وید تھے۔اُن کے ہاتھوں میں بڑی شفاء تھی ۔بادشاہ خان کے بچپن کے وہ دوست جن میں رویندر جین، اقبال عمر،مسعود، رئیسہ، نثار کی اپنی ٹولی تھی ۔یہ لوگ بھی گانے بجانے کی محفلوں کا اہتمام کرتے تھے ۔رویندر جین کو اُن دنوں رئیسہ سے عشق ہو گیا تھا۔آگے چل کر یہی رویندر جین فلمی دنیا میں ایک کامیاب موسیقار کی حیثیت سے جانا گیا تھا۔

فیاض رفعت نے اپنے اس ناول میں شیعہ سنی اتحاد کی بھی بڑی خوب صورت تصویر پیش کی ہے:

’’ محرم کے دنوں میں مسجد آباد ہو جاتی ۔ ہمارے گھر کے باہری پختہ فرش پر جازم بچھائی

جاتی۔جس پر فارسی میں عبرت نامہ تحریر ہوتا۔ دسوں دن مرثیہ خوانی کی مجلسیں ہوتیں۔سوز پڑھنے والے سماں باندھ دیتے۔ بڑوں کے ساتھ مل کر ہم سبھی بچے حضرت امام حسین کے ماتم میں خوب سینہ کوبی کرتے اور اتنا روتے کہ ہمارے چہرے آنسوؤں سے دھل جاتے۔ ماتم کرنے والوں کے لیے منزہ مٹی کے کورے مٹکوں میں مشک و عنبر کے میٹھے شربت کی سبیلیں لگائی جاتیں۔ماتم گزار نوجوان لڑکے عشرے کے دوران چُھریوں سے اپنا سینا لہو لہان کر لیتے اور شربت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے۔تعزیوں کے ٹھنڈا ہونے تک وہ بھوکے پیاسے رہتے۔بنّی ابّا کی ہدایت کے مطابق میں اور اُن کا بھتیجا مسعود مل کر مجلسوں کا اہتمام و انصرام کرتے اور پورے دس دن کالے رنگ کا ماتمی لباس پہنے سوگواری میں گزارتے۔'' (۴)

ناول علی گڑھ کے مختلف محلوں، گانے والیوں، داداگری کرنے والے افراد کی داستان سناتے ہوئے بادشاہ خان کے بچپن اور اُن کے خاندانی واقعات، اُن کے ننھیال کی کروفر، اُن کی والدہ کی محبتیں، مذہب سے وابستگی اور نسرین سے ملاقاتوں کا احوال بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

فیاض رفعت پھر ایک بار اپنے قاری کو یونیورسٹی میں ہونے والے واقعات کی طرف لے آتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹی ہمیشہ سے دو گروپوں میں بٹی رہی ایک گروپ جماعت اسلامی کا تھا اور دوسرا گروپ کمیونسٹوں کا تھا جن میں آئے دن اختلاف رہتا تھا لیکن پھر ایک اور گروپ پیدا ہو گیا یہ گروپ کٹّر راشٹر وادی جن سنگھوں کا تھا۔طلباء کی یونین کے انتخاب میں جن سنگھی گروپ کا اُمیدوار ہار گیا تھا۔ روایت کے مطابق ہارے ہوئے اُمیدوار اقبال سنگھ کا جنازہ نکالا گیا۔جس سے وہ اور اُس کے ساتھی بھڑک اُٹھے۔یونیورسٹی میں ہاتھا پائی ہوئی لیکن انتظامیہ نے بیچ بچاؤ کر دیا لیکن ہندو مہا سبھا کا نمائندہ نومان پنڈت بھڑک اُٹھا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر میں آتش گی شروع کر دی اور حالات فساد کی لپیٹ میں آ گئے۔فیاض رفعت نے ان حالات کی عکاسی نہایت بولڈ انداز میں کی ہے:

'' ہندو مہا سبھا کا نمائندہ نومان پنڈت '' ہر ہر مہا دیو'' کا نعرہ لگا کر شہر میں جگہ جگہ بدامنی پھیلانے لگا۔اُس کی ٹولی کے غنڈوں نے شہر کے مسلمانوں کی دکانوں میں آگ لگا دی۔ مانک چوک میں وضع دار مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔جن ہندوؤں پر وہ صدیوں سے تکیہ کرتے آئے تھے۔اُن کی رگوں میں بھی منافرت کا نیلا زہر پھیل چکا تھا۔وہ غنیم کی صورت اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوئے اور اُنھیں تاراج کر دیا۔گنگا جمنی تہذیب قتل ہو رہی تھی اور پولیس انتظامیہ تماشائی بنا ہوا تھا۔ پی۔اے۔سی کے سپاہیوں نے فسادیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ مرنے والوں میں پسماندہ غریب کاریگر، پھیری لگا کر سودا بیچنے والے اور روز کی دہاڑی اُٹھانے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔'' (۵)

ایسے فساد زدہ شہر میں بادشاہ کا بادشاہ خان کا دلچسپ واقعہ بھی دیکھ لیں:

'' میں شیشے والی مسجد سے ہوتا ہوا ٹن ٹن پاڑے کی طرف بڑھنے کا قصد کر رہا تھا کہ اچانک میری نظریں حفیظ قصائی کی کھلی دکان پر ٹھہر گئیں۔ ذبح کیا ہوا تازہ بکرا لوہے کے کنڈے میں اٹکا ہوا تھا۔ جس کے نرخرے سے تازہ خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میرا لونڈا پن عود کر آیا۔ میں نے لپک کر اُس کو ہک سے نکالا اور گردن پر اُٹھائے آرام سے گھر کی طرف چل پڑا۔ سامنے سے یو پی پولیس کے دو سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لے لپکے چلے آرہے تھے۔ اُنھوں نے نظر بھر کر مجھے دیکھا۔ خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی میں پسینہ آ گیا مگر یہ دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ دونوں سپاہی چیخ مار کر پلٹ گئے۔ اُن کے نرخرے سے عجب طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ خوف کی نفسیات اُن پر حاوی ہو گئی تھی ۔ بکرے کی ٹانگ اُنھیں کسی آدمی کی ٹانگ نظر آرہی تھی۔'' (۶)

بادشاہ خان کی تعلیمی لاپرواہیوں اور علی گڑھ کی سرگرمیوں سے بددل ہو کر ممتا اُسے تعلیم کی غرض سے دہلی روانہ کرتی ہے۔ دہلی کا اپنا انداز ہے۔ اُجڑنا اور پھر بسنا، تہذیبوں کو پروان چڑھانا اور پھر نئی تہذیب کو پلو پسار کر اپنے سینے سے لگانا۔ وقت کا ساتھ بھی دینا اور بدلتے وقت کے ساتھ ہی لوگوں کے مزاج کا بھی بدل جانا، یہاں مروت کو بے مروتی میں بدلنے میں دیر نہیں لگتی ،وفاؤں کے وہ گھونگھٹ جو اپنی روائتوں کے لیے جان دے دیا کرتے تھے، نئی تہذیب نے اُن کے سر سے پلّو، اور آنکھوں سے حیا کی ڈوریں کھینچ لی تھیں۔ آبادی کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا اور جمنا سکڑتی جارہی تھی ۔ صنعتی ترقی کی گود میں پروان چڑھنے والے کارخانوں کے منہ سے آلودگی کا زہر اُگلتی چمنیوں کے سائے میں غربت کی چادر اوڑھے بستیاں، اور دولت کی ریل پیل میں سر اُٹھاتی اونچی اونچی عمارتیں، فائیو اسٹار کلچر کی ترغیب دینے والے رنگین ہوٹلوں سے پرے کچھ دل ایسے تھے جن میں دہلی بستی تھی، جن کے گھروں میں اور دلوں میں دہلوی تہذیب اب بھی سانسیں لے رہی تھیں۔ ایسے لگوں میں پنڈت آنند موہن گلزار زتشی (نظامی) ا میر مشتاق، چندر بھان، بشیشور پرساد منور لکھنوی، منشی عتیق الرحمٰن، مولوی سمیع اللہ قاسمی اور شام ناتھ وغیرہ کے مزاجوں سے دہلی کی بو باس مہکتی تھی۔ دہلی کی اس بدلتی صورتِ حال کا نقشہ فیاض رفعت کا قلم نہایت خوبی کے ساتھ رقم کرتا ہے:

'' کریم نانبائی کا ٹھیہ زمین سے اُٹھ کر سنگ مرمر کے اونچے محراب دار مطبخ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گانے بجانے کے شوقین سلطان بائی کا سلیمان ٹی اسٹال آباد تھا۔ جس کی میزوں پر شاہی ٹکڑوں کی شیرینی ہنوز بکھری ہوئی تھی۔ ہیرالعل فلک اور حیدر بیابانی کے شاگردوں کی ٹولیاں شعر و سخن کی محفلیں آباد کر رہی تھیں۔ ایڈورڈ پارک نیتا جی سبھاش پارک میں تبدیل ہو چکا تھا اور ایڈورڈ کا شکستہ مجسمہ وقت کی ستم ظریفی پر خنداں زن تھا۔ مسجد کے رُخ پر مینا بازار کے عین وسط میں مولانا ابوالکلام کا مزار سونا پڑا تھا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آستاں کیسے کیسے

مچھلیوں کے بڑے آڑھتیے محمد یوسف جامعی 'شاہراہ' نکال رہے تھے۔ شوکت فہمی کا 'دین

دنیا' مسلمانوں کی عاقبت سنوارنے میں لگا ہوا تھا۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی کا 'آستانہ' اور 'پیام مشرق' تبلیغی ادب کو فروغ دے رہے تھے۔ 'آریہ ورت' اور 'پرتاپ' کے روپ میں ہندو صحافت کا بول بالا ہو رہا تھا۔ مہاشہ رنبیر 'ملاپ' کے ذریعے ہندو مسلم ایکتا کا خواب دیکھ رہے تھے۔ روزنامہ 'دعوت' مسلمانوں کی زبوں حالی پر بدستور نوحہ سنج تھا۔ ادارہ 'شمع' آباد تھا۔ معموں کی بہار تھی۔ ایشیا کا یہ سب سے بڑا اشاعتی ادارہ تھا جو اپنے لکھنے والوں کو معقول معاوضہ دیتا تھا۔ 'کتب خانہ عزیزیہ' کے مولوی سمیع اللہ قاسمی بھی تابندہ و روشن تھے۔ شام ہوتے ہوتے ادیبوں شاعروں کی آوا جاہی شروع ہو جاتی۔ بیرون دلّی کے مہمان لکھنے پڑھنے والے سبھی رونق افروز ہوتے۔ خستہ حالوں کو وہ اپنا مہمان بنا لیتے۔ وہیں جامع مسجد کی ایک گلی میں اُن کا مکان آنے جانے والوں مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ چائے، کھانا اور ناشتہ بھی اُن کے ذمے تھا۔ ضرورت مندوں کی بند مٹھی سے مدد کرتے رہتے۔ اُن کی دکان کے پھٹے پر اکثر سرخ و سپید گورے چٹے میر مشتاق نظر آتے جنھوں نے تقسیم کے مارے دن دھاڑے دلّی والوں کی جہاں تہاں سے اشک شوئی کی تھی۔ '' (۷)

بادشاہ خان اپنے قیام دہلی کے بہت سارے واقعات بیان کرتا ہے۔ جن میں وہ ہمدرد انسان بھی ہیں، غنڈے موالی بھی ہیں۔ دین دار بھی ہیں اور بے دین بھی۔ یہاں اُس کے جاں نثار دوست بھی ملتے ہیں اور دو ایسی بہنوں سے بھی اُس کا سابقہ پڑتا ہے جن سے وہ جسمانی لذتوں کا لطف بھی اُٹھاتا ہے۔

وہ مغنیہ طوائفیں بھی ہیں جو پیٹ کی خاطر نوابوں، بنیوں اور سیاسی لوگوں کے ظلم و جبر کو برداشت کرتی ہوئی، کبھی سسکتی ہوئی اور کبھی موت سے دوچار ہوتی ہوئی زندگی کے دن گزارتی ہے۔ بادشاہ اب ممبئی میں آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائرکٹر ہے۔ جہاں اُس سے ملنے کے لیے نسرین اختر آئی تھی۔ وہ اب فلموں میں کام کرنا چاہتی ہے۔ سمندر کے کنارے ایک عالیشان بنگلے میں رہتی ہے۔ وہ بادشاہ خان کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور ایک رات گزار کر اور ماضی کے سارے صفحات کی ورق گردانی کر کے وہ واپس آجاتا ہے۔

فیاض رفعت نے اپنے ممبئی کے کئی دوستوں کی ملاقاتوں کا بھی اس ناول میں تذکرہ کیا ہے۔ جن میں اہم جاوید ناصر، محمود ایوبی، رویندر جین، مینا کشی، اور فلم اسٹار ریحانہ سلطانہ وغیرہ کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً جاوید ناصر کی بادہ نوشی، محمود ایوبی کے گھر ہونے والی دعوتوں، رویندر جین کی شادی کی تقریب، اور ریحانہ سلطانہ کے ادبی ذوق کے بارے میں کہ وہ سعادت حسن منٹو، اور ابن انشاء کی فین تھی۔ فیاض رفعت کو منظر نگاری پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔ چند نمونے اس کے بھی، جاگ اور نیند کے درمیانی وقفے کے اس احساس کی زبان اور روانی ملاحظہ فرمائیں:

'' نیم ملگجی اندھیرے میں میری آنکھ کھلی تو رات انگڑائی لے کر صبح کی پہلی کرن کا منہ چوم رہی تھی اور یہ دیکھ کر میں آئینہ حیرت بن گیا کہ نیم اندھیرے میں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے والی ہوشربا قیامت جو ابھی چند ساعتوں پہلے تک میرے شانوں پر زلفیں بکھرائے مدماتی

نیند میں ڈوبی تبسم کر رہی تھی، دن کے اُجالے
میں معدوم ہوگئی ۔ یہ کون تھا جو میری آتش
شوق کو بھڑکا کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا
تھا،اور میں آگ کے دریا میں بہت گہرائی تک
ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ تو پھر کیا بدن ہی عشق کا
استعارہ ٹھہرا تھا، یا میں جاگ کر بھی ہنوز خواب
میں تھا ۔ چہروں کا کولاج بنتا چلا گیا ۔ رئیسہ،
رضو باجی، منّی اور نسرین کبھی خواب کی صورت
میرے ذہن و دل پر کچوکے لگا رہی تھیں ۔
رئیسہ کی آنکھوں میں خاموش آنسو تھے ۔رضو
باجی کے بدن سے آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں
۔منّی گنگوتری کے مقدس پانی میں شرابور ہوکر
روحانی پاکیزگی کی تلاش میں افتاں وخیزاں تھی
کہ اُس کا زندہ وتابندہ دیوتا سرحدوں میں بٹا
ہوا تھا، اور پھر نسرین تھی ۔ میرا پہلا پیار جس
میں بیک وقت رئیسہ، رضو باجی اور منّی بسیرا
کرتی تھیں۔'' (۸)

اور اکی نظر کاشی کی صبح پر بھی

'' سورج دیوتا نے کسمسا کر آنکھ کھولی تو
اندھیرے کی چادر تار تار ہوگئی۔روشنی کی آڑی
ترچھی لکیریں مندروں کے کلس کو روشن کرتی
چلی گئیں ۔ ناقوس کی صدائیں گنگا کی مقدس
لہروں کے ساتھ لپٹ لپٹ گئیں ۔ پانچ ہزار
سال پرانی دیبی دیوتاؤں کی پورانک نگری
کاشی کائنات کی تخلیق نو کے رمز کو زندہ وتابندہ
کر رہی تھی ۔ یہ موکش، نروان اور نجات کی
کرشمائی دھرتی تھی جس کے ذرے ذرے میں
والہانہ مسرتوں کے الوہی راز مضمر تھے ۔جن
کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھانے کے لیے
کپل وستو کے شہزادے گوتم نیلا مبر نے بھکشو کا
روپ دھار لیا تھااور نروان کی جستجو میں ہزاروں
اذیتوں سے گزرتے ہوئے کاشی کی مقدس سر
زمین پر سجدہ ریز ہوئے تھے ۔کیا اُن کی منو
کامنا پوری ہوگئی تھی ۔کیا اُنھوں نے نجات و
برأت کی منزل پالی تھی۔'' (۹)

بادشاہ خان کی تمثیل میں فیاض رفعت نے مبالغہ آرائی سے کہیں بھی کام نہیں لیا بلکہ اس میں موجود واقعات یقین کے دائرے سے باہر بھی نہیں ہیں اور ناہی اس میں موجود کرداروں کی تضحیک کی گئی ہے بلکہ جس کا بھی ذکر آیا ہے پورے خلوص کے ساتھ آیا ہے۔۲۵۶ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ سوانح ناول صرف دلچسپ ہی نہیں ہے بلکہ ماضی قریب کی بہت ساری روائتوں ،قدروں اور تہذیب کے بہت سارے اوراق ہم پر کھولتی ہے۔ آخر میں فیاض رفعت کو اس ناول نگاری کے لیے میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) بنارس والی گلی۔ص۔۷۔تخلیق کار پبلیشرز۔
دہلی۔سن اشاعت۔۲۰۱۸ء
(۲) بنارس والی گلی۔ص۔ ۸
(۳) بنارس والی گلی۔ص۔ ۱۵
(۴) بنارس والی گلی۔ص۔ ۲۵
(۵) بنارس والی گلی۔ص۔ ۶۰
(۶) بنارس والی گلی۔ص۔۶۳
(۷) بنارس والی گلی۔ص۔۷۷تا۷۸
(۸) بنارس والی گلی۔ص۔۷۵ (۹) بنارس والی گلی۔ص۔۲۳۰

فیروز عالم

مضمون

قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''سیتا ہرن'': ایک تنقیدی جائزہ

قرۃ العین حیدر اردو افسانوی ادب کا ایک روشن اور درخشندہ نام ہے۔ان کے ناولوں اور افسانوں میں ایک جہان معنی آباد ہے جس سے پوری طرح محظوظ ہونے اور بخوبی سمجھنے کے لیے کثرتِ مطالعہ و مشاہدہ، تاریخی بصیرت اور سماجی صورت حال اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر ضروری ہے ۔ ستاروں سے آگے (1947ء) سے لے کر ''جگنوؤں کی دنیا'' (1990ء) تک اور میرے بھی صنم خانے (1949ء) سے لے کر ''شاہراہ حریر'' (2002ء) تک کبھی ان کے فن کی چمک ماند نہیں پڑی۔ گذشتہ نصف صدی کے عرصے میں انھوں نے اردو ادب کو کئی شاہکار دیے ہیں جن میں ''آگ کا دریا'' سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں مشترکہ تہذیب کا زوال، تقسیم وطن، فسادات، ہجرت، تنہائی، گم شدگی، مغرب اور مشرق کی کش مکش اور بین الاقوامیت کے تنازعات اور پیچیدگی اور جاگیر دارانہ نظام کے زوال کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔تاریخ اور فلسفے پر گہری نظر اور ادبیات عالم کے ساتھ ساتھ عصری صورت حال سے بھر پور واقفیت نے ان کے ناولوں اور افسانوں کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔قرۃ العین حیدر کا خیال تھا کہ قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں ماضی اور حال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ان کے یہاں وقت ایک اکائی ہے اور وہ حال کو ماضی کے اثرات وعوامل سے الگ نہیں کرتیں۔آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر اور گردش رنگ چمن تینوں بڑے ناولوں میں ماضی کا سفر حال کو روشن تر بناتا ہے۔قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور انھیں ماضی پرستی سے بچاتا ہے۔ان ناولوں کے ساتھ ان کے چار ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''، ''دلربا''، ''سیتا ہرن'' اور ''چائے کے باغ'' بھی منظر عام پر آئے جنھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سیتا ہرن پہلی بار ''نیادور'' کراچی کے طویل کہانی نمبر، شمارہ (25-26)-1960 میں شائع ہوا۔

ہندوستان کی عظیم الشان تاریخ، مشترکہ قومی تہذیب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ان کے ناولوں میں اہم موضوع کے طور پر ابھرے ہیں۔اپنے پہلے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' سے لے کر ''گردش رنگ چمن'' تک انھوں نے اپنے ناولوں میں جس ہندوستان کی تصویر کشی کی ہے وہ برطانوی نوآبادی کا ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں حد درجہ رواداری اور لبرلزم کی ایک خوشگوار فضا قائم ہے۔اس میں جو طبقہ سامنے آیا ہے اس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی کی کوئی تمیز نہیں بلکہ ہندوستانی، انگریز اور اینگلو اینڈین ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ دراصل ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ ہے جس کا مذہب اور کلچر اس کا طبقہ ہی ہے۔ ہندو محرم مناتے ہیں، مسلمان ہولی دیوالی مناتے ہیں اور سب مل کر کرسمس بھی مناتے ہیں۔اس ہندوستان میں سلطنت اودھ، مغلیہ حکومت اور قدیم ہندوستان کی تہذیبوں کی خوب صورت آمیزش نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قوموں کا تہذیبی تشخص، ان کی تاریخ اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ماضی اور حال کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں انسانی وجود کے داخلی اضطراب، ذہنی کرب اور احساس تنہائی کو نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ان کے نزدیک معاشرہ اور فرد کے درمیان تصادم اور کش مکش ازلی ہے۔اور تاریخ اور وقت کی ان دیکھی قوت کے سامنے انسان

مجبور ہے۔ وقت اور تاریخ کا جبر افراد کی زندگی میں ذہنی شکست وریخت کی صورت میں نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں ایک ایسی مشترکہ تہذیب کو موضوع بنایا ہے اور اپنے تہہ دار کرداروں میں ایسی ہندوستانی شخصیت کو اجاگر کیا ہے جس کا خمیر کئی قوموں اور نسلوں کے تہذیبی اختلاط سے عبارت ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب اور اس کے افکار واقدار کو ایک نامیاتی وحدت کے روپ میں دیکھتی ہیں اور اپنی تخلیقات میں ہنرمندی سے سمو دیتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے کردار عمل سے زیادہ ذہنی تصورات اور محسوسات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں سفر کرتے ہیں۔ کرداروں کے شعور میں آ کر یہ تینوں زمانے ایک دوسرے سے مدغم اور گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ کرداروں کی اس ذہنی زندگی کو پیش کرنے کے لیے وہ شعور کی رو کی تکنیک اپناتی ہیں۔

شعور کی رو کی تکنیک انسان کی داخلی زندگی کی عکاسی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی مدد سے تخلیق کار کردار کے ذہن میں داخل ہوکر اس کے ذہنی افکار واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں ناول نگار کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کی ایسی تصویر کشی کرے جو انجام سے عبارت ہو بلکہ ناول نگار کردار کے ذہن میں ابھرنے والے خیالات، محسوسات اور ہر لمحہ اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو پیش کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے کردار چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور انھیں تاریخ کا گہرا شعور حاصل ہوتا ہے اس لیے وہ عام طور سے ان کی ذہنی زندگی کی پیش کش کے ذریعے ماضی اور حال کے باہمی رشتے پر نظر ڈالتی ہے۔

شعور کی رو کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے فلیش بیک کی تکنیک سے بھی کام لیا ہے۔ فلیش بیک سے انھوں نے اس وقت کام لیا ہے جب وقت کے کسی خاص لمحے پر پہنچ کر ناول نگاروں نے کردار کے ماضی سے کوئی پردہ اٹھایا ہے تاکہ کردار کے عمل کا جواز پیدا ہو سکے۔ بعض اوقات انھوں نے خود کلامی کے ذریعہ بھی کردار کی ذہنی زندگی آشکار کی ہے۔ خطوط اور ڈائری سے بھی اکثر انھوں نے کام لیا ہے۔ ''آخر شب کے ہم سفر'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تمام اہم کردار بنیادی طور پر ٹائپ کردار ہیں۔ یہ سبھی اپنے تجربات سے ایک ہی قسم کی مخصوص کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ ٹائپ کردار نگاری کے باوجود ان کے کچھ کرداروں کی ایسی انفرادی خصوصیات ہیں جو انھیں محض نمائندگی سے بلند کرکے قاری کے ذہن پر انفرادی اثر ڈالنے میں بھی معاون ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ''آگ کا دریا'' کا گوتم نیلمبر ٹائپ کردار ہونے کے باوجود اردو ناول کی تاریخ کا اہم کردار ہے جو قدیم ہندوستان کی روح ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ''آگ کا دریا'' کی چمپا اور ''آخری شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار بھی ایسی ہی کردار ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نسوانی کرداروں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ ان سب کا انجام المیہ ہوتا ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے سے لے کر'' چاندنی بیگم'' اور ''سیتا ہرن'' تک تمام نسوانی کردار المیہ کردار ہیں۔

منظر نگاری یا فضا سازی میں قرۃ العین حیدر کو کمال حاصل ہے۔ وہ جہاں اپنے کرداروں کی سوچ کی لہروں کو پیش کرتی ہیں وہیں ان کے ناولوں میں کرداروں کے اعمال سے زیادہ مناظر کی پیش کش ہوتی ہے۔ وہ کسی مخصوص تہذیب یا دور کی پیش کش کے لیے بھی بیان کے بجائے منظر نگاری سے کام لیتی ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے ایک دور کے ختم ہونے اور دوسرے دور کے آغاز کی خوبصورت منظر کشی ملاحظہ کیجیے:

> ''سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں ۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے

درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اُور نظر ڈالی

۔'' (آگ کا دریا)

ان دو جملوں میں قدیم دور کے خاتمے اور مسلمانوں کے دور کے آغاز کو بیان کر دیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا اسلوب قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ ان کا خوبصورت رواں دواں اور شائستہ نثری اسلوب چستی، تہہ داری اور تنوع سے بھر پور ہے۔ ان کے جملے روانی اور آہنگ سے معمور ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ کی ایمائی قوت سے ماحول کی تخلیق کرتی ہیں۔ واقعیت کا رنگ ابھارتی ہیں اور کہانی کے تار و پود سے ماورا فلسفیانہ حقائق کی طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ابتدائی ناولوں ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غم دل'' میں شاعرانہ اسلوب ملتا ہے۔ ان میں جذباتیت بھی قدرے زیادہ ہے لیکن بعد کے ناولوں، ناولٹ اور افسانوں میں یہ شاعرانہ رنگ نہیں ملتا بلکہ جذبہ فکر میں گھلا ہوا ہے اور رومانیت کے بجائے پختگی ملتی ہے۔ ان ناولوں کے اسلوب کی شعریت کا تعلق دراصل متعدد شاعرانہ الفاظ کے استعمال سے ہے جو ''میرے بھی صنم خانے'' سے لے کر'' کارِ جہاں دراز ہے'' تک میں ملتے ہیں۔ دریا، روشنی، نغمہ، پھول، پرندے، رنگ، پودے، موسم، خوشبو، سناٹا، صدا، رات، چاند اور سمندر وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ان کے تمام ناولوں اور افسانوں میں ملتے ہیں لیکن ان الفاظ کا استعمال انھوں نے برائے شاعری نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تخلیقات میں یہ الفاظ علامت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ دریا صرف بہتا پانی نہیں ہے بلکہ مختلف زبانوں کی تہذیبوں کا استعارہ ہے اور ساتھ ہی کرداروں کی ذہنی و جذباتی صورت حال کا اشاریہ بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان کے ناولٹوں پر قدرے کم توجہ دی گئی ہے۔ حالانکہ موضوع، ہئیت، پلاٹ، کردار اور اسلوب کے اعتبار سے یہ بھی نہایت اہم ہیں۔ ان کا ناولٹ ''سیتا ہرن'' عصر حاضر کی ان خواتین کو آئینہ دکھاتا ہے جو مغربی طرز معاشرت اپنا کر اپنا سب کچھ تباہ کر لیتی ہیں۔ انھیں جس وقت ہوش آتا ہے اس وقت وہ نہ گھر کی ہوتی ہیں اور نہ گھاٹ کی۔ عورت کی عصمت اور اس کا تقدس ازل سے اس کی سب سے قیمتی چیز رہی ہے اور جس نے بھی اسے گنوایا اسے بعد میں پچھتاوے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

''سیتا ہرن'' ایک علامتی ناولٹ ہے جس کی مرکزی کردار سیتا میر چندانی ہے۔ وہ سندھ کی رہنے والی ایک ہندو لڑکی ہے جو تقسیم ملک کے بعد کراچی سے ہجرت کر کے اپنے والدین کے ساتھ دہلی میں آبسی۔ کراچی میں ان کی اچھی خاصی کوٹھی تھی جسے چھوڑ کر انھیں ہندوستان آنا پڑا۔ ان کی کوٹھی میں ہندوستان سے جانے والے مہاجر آباد ہو گئے۔ دہلی میں انھیں ایک چھوٹا سا تنگ و تاریک گھر ملا جس کا پتہ بتانے میں بھی سیتا میر چندانی کو شرم آتی ہے۔ اس کا خاندان مذہبی ہے اور اس کی ماں روزانہ صبح رامائن کا پاٹھ کرتی ہیں۔ لیکن سیتا بالکل غیر مذہبی اور آزاد خیال لڑکی ہے۔ اسے مذہبی روایات، اقدار اور دیومالا پر یقین نہیں ہے۔ دہلی میں اس کے خاندان کی زندگی مسائل کا شکار ہے۔ اسی زمانے میں سیتا کے ماما (ماموں) جو امریکہ میں ایک زمانے سے مقیم ہیں اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیویارک آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ بخوشی راضی ہو جاتی ہے اور جلد ہی امریکہ پہنچ جاتی ہے۔ اس کے ماموں اور ممانی کو چونکہ کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتے ہیں اور اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ نیویارک میں ہی سیتا کی ملاقات اودھ کے علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک ہندوستانی نوجوان جمیل سے ہوتی ہے جو یو این او کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہوتے ہیں اور جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ سیتا کے ماما کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو انھیں دل کا دورہ پڑتا ہے۔

سیتا کی ممانی البتہ زیادہ روشن خیال ہیں۔ وہ سیتا کا ساتھ دیتی ہیں۔ وہ اس کی ماں کو خط لکھ کر بتاتی ہیں کہ ''سیتا نے بیاہ کرلیا ہے۔ لڑکا اپنی ذات برادری کا نہیں۔ نام جیمل ہے۔'' ممانی کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوتی ہے۔ جمیل کو جیمل بنا کر وہ سیتا کی ماں کو یکلخت صدمے سے بچالیتی ہیں ورنہ سیتا کی ماں کو جب معلوم ہوتا کہ ان کی بیٹی نے ایک مسلمان سے شادی کرلی ہے تو انھیں بھی دل کا دورہ پڑ سکتا تھا۔ سیتا اور جمیل کی ازدواجی زندگی بہت اچھی گزرتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے روٹھتے بھی ہیں اور مناتے ہیں۔ سیتا کو جلد ہی ایک بچہ بھی ہوجاتا ہے۔ راہل کی پیدائش پر سیتا کے والدین اور ماما مامی (ماموں ممانی) بے حد خوش ہوتے ہیں۔ جمیل اس کا نام راہل رکھتا ہے۔ راہل سدھارتھ کے بیٹے کا بھی نام تھا۔ یہی سدھارتھ آگے چل کر مہاتما بدھ کے نام سے مشہور ہوئے۔ سیتا کے ماما مامی کو اس بات پر بھی بے حد مسرت ہوتی ہے کہ جمیل روشن خیال ہے۔ اس نے مسلمان ہوکر بھی اپنے بچے کا ہندو نام رکھا۔ دو سال بعد جب جمیل کو دفتر سے چھٹی ملتی ہے تو وہ سیتا اور راہل کو لے کر ہندوستان آتا ہے۔ ہندوستان میں وہ سیتا کے والدین، اس کے دوستوں اور اپنے خاندان کے مختلف افراد اور رشتہ داروں سے دہلی، فیض آباد اور لکھنؤ میں ملتا ہے۔ تین مہینے کی یہ چھٹی ختم ہوتی ہے تو تینوں نیویارک واپس لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے لیکن جلد ہی اس رشتے کو گہن لگ جاتا ہے۔ کلکتے کا ایک نوجوان اور انگریزی کا شاعر ابولفصاحت قمرالاسلام چودھری ایکٹنگ سیکھنے کے لیے نیویارک آتا ہے۔ وہ بھی جمیل اور سیتا کے دوستوں کے گروپ میں شامل ہوجاتا ہے۔ سیتا اس کے بارے میں عرفان سے ایک موقعے پر بتاتی ہے:

''میں یونیورسٹی میں اپنے کام میں مصروف تھی۔ گھر واپس آکر راہل کی دیکھ بھال کرتی۔ کھانا بناتی۔ دوستوں کا حلقہ بھی وہی تھا۔ ساری باتیں پرانی جیسی تھیں۔ مگر جانے کیوں جمیل آہستہ آہستہ ری ایکشنری بنتے گئے۔ خیر میں اس کو برداشت کرلیتی۔ مگر انھوں نے شراب حد سے زیادہ پینی شروع کردی۔ جب وہ رات گئے شراب خانوں سے لوٹتے اور کھانا بنا کے ان کے انتظار میں راہ دیکھا کرتی، اس وقت قمر میرے پاس بیٹھا رہتا۔''

''اور تم سے ہمدردی کرتا۔ یہ ہمدردی کا ریکٹ بھی خوب ہوتا ہے۔''

''نہیں ہمدردی کی بات نہیں، عرفان۔ بس جانے کیا .... ہوا، انسان واقعات اور وقت کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہونے والا ہے۔'' (سیتا ہرن۔ چار ناولٹ، صفحہ۔143)

ایک دن قمر اسے اپنے گھر بلاتا ہے۔ وہاں اس کے دوسرے دوست بھی جمع ہیں۔ وہیں وہ سیتا کو اپنی منگیتر جینیفر کرین سے ملاتا ہے۔ سیتا کو شاک لگتا ہے لیکن جلد ہی وہ نارمل ہوجاتی ہے۔ جینیفر جلد ہی قمر کے فلیٹ میں منتقل ہوجاتی ہے۔ ایک سال بعد قمر جینیفر کو لے کر کلکتہ چلا جاتا ہے۔ وہاں دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی قمر واپس نیویارک آتا ہے اور سیتا سے کہتا ہے کہ وہ اس کی خاطر واپس آیا ہے کہ کیوں کہ اسے سیتا سے پیار ہے۔ سیتا اور جمیل کے رشتوں میں کھنچاؤ تو آ ہی گیا تھا، وہ قمر کی طرف ملتفت ہوتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ سیتا اور قمر کا عشق پروان چڑھتا رہا۔ سیتا دوپہر یا رات جب بھی موقع ملتا قمر کے گھر چلی جاتی۔ ایک دن قمر شراب خانے میں جمیل سے ملنے گیا اور اس سے کہا کہ مجھے تمھاری بیوی سے عشق ہوگیا ہے۔ جمیل نے اس کی زبردست پٹائی کی اور گھر آکر سیتا کی بھی خوب خبر لی اور اسے گھر سے نکال دیا۔ سیتا جب قمر کے پاس پہنچی تو اس نے بھی اسے اپنانے سے انکار کردیا۔ ناچار کسی طرح وہ چند دن اپنی دوست گریس کے اپارٹمنٹ میں رہی اور پھر ممانی سے کرائے کی رقم لے کر ہندوستان واپس آگئی۔ اس نے

اپنے والدین کو کچھ نہیں بتایا کیوں کہ والد جو پہلے سے ہی بیمار تھے شاید اس صدمے کی تاب نہ لا پاتے۔اس نے ایک بیرسٹر کے ذریعے جمیل سے خلع اور راہل کی واپسی کے لیے لکھوایا لیکن جمیل نے اسے طلاق نہیں دیا۔اس نے جواب میں لکھوایا کہ ''اس عورت کی اخلاقی حالت ایسی نہیں کہ وہ ایک معصوم بچے کی پرورش کر سکے۔'' تھک ہار کر سیتا نے پارٹیوں اور کلچرل پروگراموں میں اپنے آپ کو مصروف کرلیا۔کچھ ہی دنوں بعد جمیل نے اپنی کزن اور سیتا کی دوست بلقیس کو خط لکھا کہ اس نے ایک ہسپانوی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔

انھی دنوں جمیل کی منجھلی خالہ کا کراچی سے فون آتا ہے۔وہ اپنی بیٹی قیصر کی شادی میں سب گھر والوں کو کراچی آنے کی دعوت دیتی ہیں۔بلقیس سیتا سے بتاتی ہے کہ ''منجھلی خالہ نے سخت اصرار کیا ہے کہ تم اس میں ضرور شریک ہو۔بڑی خالہ تلسی پور سے نہیں جاسکتیں،اصغر بھیا کی بیماری کی وجہ سے۔ان کی بہو کی حیثیت سے ان کی نمائندگی تمھیں ہی کرنی ہے۔'' اس طرح وہ بلقیس کے ساتھ کراچی پہنچ جاتی ہے۔وہاں اس کی ملاقات عرفان سے ہوتی ہے۔سیتا اسے دل ہی دل میں پسند کرنے لگتی ہے اور اسے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتی ہے۔وہ اس کے ساتھ سندھ کا سفر کرتی ہے۔سندھ کے شہر حیدرآباد میں اپنے والد کے دوست پیر اللہ بخش جمالی سے ملتی ہے جو اسے ڈھیر سارے تحفے تحائف دے کر رخصت کرتے ہیں۔پاکستان میں عرفان کی صحبت میں تین ہفتے اس کا وقت بہت اچھی طرح گزرتا ہے اور پھر وہ گھڑی آجاتی ہے جب اسے دہلی کے لیے عازم سفر ہونا پڑتا ہے۔

دہلی واپس آنے کے بعد وہ پھر تھیئٹر اور دیگر کلچرل پروگراموں میں مصروف ہوجاتی ہے۔ایک ڈرامے کے اختتام پر اس کی ملاقات ایک مشہور مصور پروجیش کمار چودھری سے ہوتی ہے۔وہ عمر میں سیتا سے خاصا بڑا ہے۔پہلی ہی ملاقات میں وہ سیتا کو اپنے یہاں ڈنر کی دعوت دیتا ہے جو وہ قبول کرلیتی ہے۔اس دعوت میں قمرالاسلام چودھری بھی آتا ہے۔اس کے ہمراہ ایک نئی لڑکی مادھوری ہے۔بات چیت کے دوران سیتا کو پتہ چلتا ہے کہ قمر نے مادھوری سے شادی کر لی ہے۔اس موقعے پر قمر اور سیتا اس طرح آپس میں باتیں کرتے ہیں جیسے ان دونوں کے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں۔قمر سیتا کو اپنے گھر بلاتا ہے جہاں دوسرے دوستوں کے ساتھ جینیفر کرین بھی اپنے نئے شوہر ستیش گوپال کے ساتھ آتی ہے۔

''جینیفر سیتا کو دیکھتے ہی نعرہ لگا کر اس سے لپٹ گئی۔''ڈارلنگ ....تم کو اتنی صدیوں بعد دیکھا ہے....کیسی ہو....؟میں اب مسز گوپال ہوں....اور تم....؟''(چار ناولٹ، صفحہ-161)

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔چھ مہینے بعد سیتا نے کولمبو جانے کا پلان بنایا۔اسے معلوم ہوا تھا کہ عرفان کولمبو جا رہا ہے۔ٹھیک انھی تاریخوں میں جمیل بھی کولمبو آرہا تھا۔سیتا نے بلقیس کو بتایا کہ وہ کولمبو جمیل سے ملنے اور ان سے گزارش کرنے جارہی ہے کہ راہل کو اسے دے دیں۔وہ کولمبو جاتی ضرور ہے لیکن اس کا مطمحِ نظر عرفان ہے، جمیل نہیں۔یہی وجہ ہے کہ کولمبو کے دس بارہ دن کے قیام میں وہ جمیل سے ملنے کے لیے وقت نہیں نکال پاتی۔بلکہ اس اثنا میں عرفان کانفرنس میں سخت مصروف رہتا ہے تو وہ اکیلے ہی کولمبو کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کو نکل جاتی ہے۔وہ جس ریسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہوتی ہے وہیں ایک امریکی سیاح لیزلی مارش جو پیشے سے آرکیولوجسٹ ہے، آکر ٹھہرتا ہے۔وہ دراصل راستے سے ہی اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچتا ہے۔بہت جلد دونوں میں دوستی ہوجاتی ہے اور سیتا اس کے ساتھ کولمبو کے مضافات کے تفریحی مقامات اور بودھ مندروں کی سیر کرتی پھرتی ہے۔لیزلی مارش اسے ہل اسٹیشن نیورا ایلیا لے کر جاتا ہے اور ہوٹل کے رجسٹر

میں مسٹر اینڈ مسز لیز لی مارش کے نام سے اپنا اور سیتا کا اندراج کراتا ہے۔ایک ہفتے کی سیر کے بعد وہ واپس کولمبو لوٹتی ہے تو عرفان سے یہ بھی بتا دیتی ہے کہ اس پورے عرصے میں لیز لی مارش اس کا ہم سفر تھا۔عرفان اس پر برہم ہو جاتا ہے۔دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے اور آخر کار وہ اسے اپنے کمرے سے باہر نکال دیتی ہے۔سیتا عرفان کے جانے کے بعد رات بھر روتی ہے اور صبح اٹھ کر دہلی آنے کے لیے فلائٹ کا ٹکٹ لینے کے لیے ایئر لائن سے لے کر اخبار کے دفتر تک کا چکر لگاتی ہے۔لیکن کانفرنس کے مندوبین کی واپسی اور سری لنکا میں تاملوں اور سنہلیوں کے درمیان فساد شروع ہو جانے کی وجہ سے اسے ٹکٹ نہیں مل پاتا۔اسی اثنا میں عرفان اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے اور اس سے رات والے واقعے کے لیے معافی مانگ لیتا ہے۔وہ سیتا سے شادی کی خواہش کا بھی اظہار کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ کل رات جمیل سے ملا تھا اور انھیں یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ وہ سیتا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔اس لیے وہ سیتا کو طلاق دے دیں۔

کولمبو سے واپسی کے بعد سیتا چند دن دہلی میں رہتی ہے اور پھر پیرس چلی جاتی ہے۔وہ اور عرفان پیرس میں کئی مہینے ایک ساتھ رہتے ہیں۔وہ روزانہ انتظار کرتی ہے کہ شاید نیویارک سے طلاق نامہ آجائے۔وقت گزرتا جاتا ہے لیکن طلاق نامہ نہیں آپاتا۔اس درمیان دہلی سے خط آتا ہے کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔وہ آناً فاناً ہندوستان واپس آجاتی ہے۔اب اسے زندگی بالکل اجاڑ اور تکلیف دہ محسوس ہونے لگتی ہے۔وہ دوستوں سے ملنا جلنا بھی بند کر دیتی ہے۔اسے بس جمیل کے طلاق نامے اور عرفان کے خط کا انتظار رہتا ہے۔اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ بالکل تنہا ہو گئی ہے۔اتنی بڑی دنیا میں کوئی اس کا ہمدرد نہیں۔اسی درمیان اسے پروجیش چودھری کا خیال آتا ہے جو اس زمانے میں اپنی پینٹنگس کی نمائش کے سلسلے میں دہلی آیا ہوا ہے۔وہ اس کی قیام گاہ پر پہنچ جاتی ہے۔

اب پروجیش چودھری سے اس کے تعلقات قائم ہوتے ہیں اور پورے شہر میں اس کے جاننے والوں کو اس بات کی خبر ہو جاتی ہے۔اس طرح چھ مہینے گزر جاتے ہیں۔ایک دن اسے دو خطوط موصول ہوتے ہیں ایک عرفان کا اور دوسرا جمیل کا۔عرفان اپنے خط میں پوچھتا ہے کہ ''تازہ ترین خبریں جو تمھارے متعلق سنی ہیں، صحیح ہیں؟'' جمیل اپنے خط میں لکھتا ہے کہ ''میں تم کو طلاق دے رہا ہوں۔تم اب آزاد ہو اور جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔'' دوسرے دن وہ عرفان کو جواب میں لکھتی ہے۔''میں بھائی کا انتظار کر رہی ہوں۔وہ یہاں آجائے تو ممی اور لیلا، موتی کو اس کے ساتھ درگا پور بھیج کر فوراً تمھارے پاس پہنچوں گی۔میرا انتظار کرو......میں تمھیں........اور صرف تمھیں چاہتی ہوں۔اور انت سے تک اسی طرح چاہوں گی.....'' (چار ناولٹ، صفحہ۔249)

سیتا دہلی میں اپنے تمام شناساؤں سے مل کر پیرس پہنچتی ہے۔لیکن وہ جب عرفان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو ایک اجنبی شخص دروازہ کھولتا ہے۔وہ سیتا کے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ عرفان نے کسی اور لڑکی سے شادی کر لی ہے اور اسے لے کر دو مہینے کے لیے کہیں باہر چلا گیا ہے۔یہیں ناولٹ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

''سیتا ہرن'' میں سماج کے اس اعلیٰ طبقے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کی نئی نسل مغرب زدہ ہے۔اسے مشرقی اقدار یا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔اس سے تعلق رکھنے والے بعض افراد لباس کی طرح اپنے شوہر یا بیوی بدلتے ہیں۔البتہ ہما، بلقیس اور جمیل ان آلائشوں سے اپنے آپ کو پاک رکھنے میں کامیاب ہیں۔''سیتا ہرن'' میں قرۃ العین حیدر نے سماج کے اس مخصوص طبقے کی عکاسی کی ہے جو مذہب اور سماج کی قدیم اقدار کو بیکار محض سمجھتا ہے۔اس کے زیادہ تر کردار ان اخلاقی اقدار اور رسوم و رواجات سے عاری ہیں جو ہندوستانی معاشرے کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں۔اس ناولٹ کی مرکزی کردار سیتا تو انتہا درجے کی مذہب بیزار ہے۔وہ پرانی نسل

کی مذہبیت سے کس قدر متنفر ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''.....اس کے دروازے پر ہما کی اماں مونڈھا بچھائے بیٹھی گیتا پڑھ رہی تھیں۔ کس قدر دقیانوسی مذہبی عورت تھیں۔ اتنے تعلیم یافتہ روشن خیال بچوں کی ایسی اولڈ فیشن ماں۔ اس کی اپنی ماں بھی اتنی ہی مذہبی تھی۔ اس کی ساس بھی، بلقیس کی ماں بھی۔ شالوں اور دوپٹوں میں لپٹی لپٹائی گڑیا ایسی کمزور عورتیں، جو ہر سے اپنے بچوں کے لیے دعائیں مانگتی تھیں، اچھے اور برے شگون دیکھتی تھیں، برت اور روزے رکھتی تھیں۔ مائیں مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔'' (چار ناولٹ، صفحہ۔79)

سیتا اپنی دوست ہما کے گھر جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ الماریوں میں ہما کی کتابیں بے کسی کے عالم میں پڑی ہیں، دیواروں پر مانی پوری ٹوپیاں اور جگن ناتھ جی کے چوبی بت آویزاں ہیں۔ بغل والے کمرے کی الماری بھی دیوی دیوتاؤں سے بھری ہوئی تھی۔'' اس گھر میں دیوی دیوتاؤں کی اس قدر بھر مار تھی کہ سیتا کا جی ہو لا جاتا تھا۔'' (چار ناولٹ، صفحہ۔80)

سیتا ایک ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جو اخلاقیات سے عاری ہے۔ تقدس اور پاکیزگی جو مشرقی عورت کی سب سے قیمتی شے ہیں، اس میں نام کو نہیں۔ وہ جمیل جیسے محبت کرنے والے شوہر کو دھوکہ دیتی ہے اور قمر الاسلام کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ یہی دونوں میں علاحدگی کی وجہ بنتی ہے۔ جمیل کے بعد قمر الاسلام چودھری، لیزلی مارش، پروجیش بابو اور عرفان کئی افراد سے اس کے تعلقات قائم ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی رشتہ پائیدار ثابت نہیں ہوتا۔ یہ افراد اس کے جنسی جذبے کی تسکین کا سامان ضرور فراہم کرتے ہیں لیکن وہ حقیقی خوشی اور قلبی سکون سے محروم رہتی ہے۔ وہ سب کے ساتھ رہ کر بھی تنہا ہے۔ سیتا ایک ایسی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ وہ لباس کی طرح مرد بدلنے کی قائل ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے کسی نہ کسی مرد کو پھانس لیتی ہے یا کوئی مرد اسے بآسانی پھانس لیتا ہے۔ وہ شوہر اور بیوی کے رشتے کا تقدس تو تار تار کرتی ہی ہے، ایک ماں کا فرض بھی ادا نہیں کر پاتی۔ اس کے مقابلے میں ناولٹ میں ہما کا کردار پیش کیا گیا ہے جو اپنے بچے کی خدمت میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ وہ ایک آئی اے ایس افسر ہے۔ وہ مذہبی نہیں ہے لیکن وہ نہ صرف اپنے والدین کا خیال رکھتے ہوئے مندر جاتی ہے بلکہ ان کے دیگر مشاغل میں بھی ساتھ رہتی ہے۔

اس ناولٹ میں بزرگ نسل کی ہندو عورتوں کا کردار مذہبیت سے بھرپور تو ہے ہی ان میں رواداری اور صبر و تحمل بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ سیتا کی مامی اس کے جمیل سے شادی کرنے کے بعد پورے خاندان کے لوگوں کو بے حد دانش مندی کے ساتھ اور حکمت عملی کا استعمال کرتے ہوئے اس شادی کو قبول کرنے پر رضامند کر لیتی ہیں۔ ہما کی ماں بھی بہت مذہبی ہیں لیکن مذہبی کٹر پن ان میں بالکل نہیں ہے۔ سیتا ان کے دیوی دیوتاؤں والے کمرے کے پاس مل جاتی ہے تو وہ اس سے یوں ہم کلام ہوتی ہیں:

''اری ان کو پرنام تو کر لے۔ تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ بھگوان تو ہر شے میں ہیں۔ اری باؤلی ڈرے کیوں.....میری بھی دو بھتیجیوں نے مسلمانوں سے بیاہ کر لیا۔ آج کل یہی ہوا چلی ہے۔ اب ان کو گھر سے نکال تھوڑا ہی دیا......میری اپنی ہما نے غیر کف میں شادی کر لی.....اتنی دور مرہٹواڑے چلی گئی....پھر اب کیا ہو.....زمانہ ہی ایسا ہے۔'' (چار ناولٹ، صفحہ۔83)

یہ خواتین وقت کی نبض پہچانتی ہیں اور بدلتے وقت کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کو قبول کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔

سیتا کو اپنی جنم بھومی سے بہت لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بلقیس اسے کراچی جانے کی بات کرتی ہے تو خوش ہو جاتی ہے کہ اب وہ سندھ کے اس مقام کو بھی دیکھ سکے گی جہاں وہ پیدا ہوئی اور

جہاں اس کا بچپن گزرا۔ وہ دراصل اس طبقے کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے جس کا وطن چھوٹ گیا ہے۔

سیتا کے علاوہ اس ناولٹ میں جمیل اور عرفان کے کردار بھی اہم ہیں۔ جمیل تعلیم یافتہ، روادار، روشن خیال اور ہمدرد لیکن اصول پسند انسان کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر ہے۔ وہ سیتا سے نکاح کرتا ہے لیکن اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے کا نام راحل رکھتا ہے۔ وہ امریکہ میں رہتا ہے لیکن مشرقی اقدار اسے بے حد عزیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے جب سیتا اور قمر الاسلام کے درمیان تعلقات کا پتہ چلتا ہے تو سیتا کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ وہ بیٹے کو اپنے پاس ہی رکھتا ہے کیوں کہ اسے یقین ہے کہ سیتا اس کی اچھی طرح پرورش نہیں کر سکتی۔ وہ راحل کو حصول تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی بھیجتا ہے تا کہ وہ مشرقی تہذیب وثقافت اور اقدار سے آشنا ہو سکے۔ وہ سیتا کو عرفان کے کہنے پر طلاق بھی دے دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ راحل سے مل سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وسیع الذہن انسان ہے اور سخت دل نہیں ہے۔ اس کردار میں ایک ہی خرابی ہے اس کی شراب نوشی۔ وہ جب قمر سے سیتا کے تعلقات بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو شراب میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو راہ راست پر لانے کی تدبیر کرتا۔

عرفان بھی ایک روشن خیال، باضمیر، ہمدرد اور خوش اخلاق نوجوان کی شکل میں اجاگر ہوتا ہے۔ وہ سیتا کے ماضی اور حال سے واقف ہونے کے باوجود اسے اپنانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ سیتا اس پر بری طرح فریفتہ ہے اس بات سے واقف ہونے کے باوجود وہ سیتا سے دوری بنائے رکھتا ہے۔ سندھ کی سیر کرتے ہوئے وہ اپنی گاڑی خاندان کے دوسرے لوگوں سے آگے رکھتا ہے تا کہ وہ دونوں ان لوگوں کی نظر میں رہیں اور کسی کو ان پر شبہ نہ ہو۔ وہ سیتا کی زندگی کو استحکام دینے کی نیت سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کو اپنے ارادے سے واقف کراتا ہے تو وہ بے حد خوش ہوتی ہے۔ وہ بغیر شادی کیے اس کے ساتھ پیرس میں کئی مہینے گزارتی ہے۔ لیکن والد کے انتقال کے بعد جب ہندوستان آتی ہے تو پھر اسی دلدل میں جا گرتی ہے۔ عرفان شادی کے لیے اس کا انتظار کرتا رہتا ہے لیکن جمیل کا طلاق نامہ نہ آنے کے سبب وہ پیرس نہیں پہنچ پاتی اور اس درمیان بھی پروجیش کمار کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہتی ہے۔ قدرت شاید اسی کی سزا دیتی ہے کہ جمیل کے طلاق دینے کے باوجود وہ عرفان سے شادی نہیں کر پاتی۔ اس کے پیرس آنے میں دیر ہوتی ہے تو عرفان سمجھتا ہے کہ شاید سیتا نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ کسی اور لڑکی سے شادی کر کے دو مہینے کی چھٹی پر کراچی چلا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سیتا اسے دل و جان سے چاہنے لگی ہے۔ جیسے ہی اسے جمیل طلاق دیتا ہے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیرس کی راہ لیتی ہے۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہے اور ازلی تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ نئے سرے سے ایک گرہستن کی زندگی گزارنے کا اس کا سپنا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ عرفان کا کردار ایک ایسے نوجوان کا ہے جو ماضی کی کمیوں اور غلطیوں پر توجہ دینے کی بجائے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کا آرزومند ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی کشادہ ذہنی اور معاف کر دینے کی صلاحیت ہے جو قاری کے دل میں اس کی جگہ بناتی ہے۔

ابوالفصاحت قمر الاسلام اور پروجیش چودھری اوباش فطرت اور بے ضمیر قسم کے افراد ہیں جو عورتوں کو صرف استعمال کرنے کی چیز سمجھتے ہیں۔ انھیں عورتوں کو پھانسنے کے بہت سے طریقے آتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے جنسی جذبے کی تسکین کرتے ہیں۔

''سیتا ہرن'' کا پلاٹ پیچیدہ ہے۔ اس کی کہانی درمیان سے

شروع ہوتی ہے اور پھر مختلف واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پورا ناولٹ پڑھنے کے بعد ہی اس کی کہانی کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا میدان عمل بھی ہندوستان، پاکستان، امریکہ، فرانس سے لے کر سری لنکا تک پھیلا ہوا ہے۔

اس ناولٹ میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ فلیش بیک، خطوط اور خود کلامی سے بھی ناولٹ نگار نے کام لیا ہے۔ کئی مقامات پر عہد حاضر کو ویدک عہد سے جوڑ کر ناولٹ میں معنویت پیدا کی گئی ہے۔ سیتا کا نام خود ہی ہندوستانی دیومالا کی ایک اہم علامت ہے۔ 'سیتا ہرن' بھی ایک علامتی عنوان ہے۔ قدیم عہد میں راون نے سیتا کا ہرن (اغوا) کیا تھا لیکن آج کی سیتا نے خود اپنے ہرن کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ وہ مغربی طرز زندگی کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر خود بخوشی دورِ حاضر کے راون کا شکار بن رہی ہے۔

اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر کا خوبصورت، رواں دواں اور شائستہ نثری اسلوب قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ اس کے اسلوب میں تہہ داری اور تنوع ہے۔ اس میں ناولٹ نگار نے کرداروں اور موقع و محل کے اعتبار سے زبان و اسلوب اختیار کیا ہے۔ علامتی انداز میں لکھے گئے اس ناولٹ میں کہیں کہیں طنز اور ایک آدھ جگہ مزاح سے بھی کام لیا گیا ہے۔ تخلیقی نثر کے نمونے بھی اس میں موجود ہیں۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

''دھان کی اچھی فصل بونے کا انحصار بونے والے کی ذاتی خوبیوں پر نہیں ہوتا۔''

''افق کا منظر خزاں نے کتنا خوبصورت بنا دیا ہے۔''

''گھوڑے آسمان کو اپنی ٹاپوں سے اڑائے دے رہے ہیں۔''

''جوار بھاٹا کے نشانوں کے مانند ان کی گھنٹیاں خاموش ہیں۔''

''بغیر پھولوں کے درخت نااہل بادشاہوں کی سیاسی کارروائیوں کی طرح اجاڑ ہیں۔ زمین پر جھاڑ جھنکاڑ بے وقوف انسانوں کے دماغ کے ناقابل عمل منصوبوں کی طرح اگ رہا ہے۔''

''پتیوں سے عاری درخت اس طرح کھڑے ہیں جیسے کسی کی ارتھی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔''

بہ اعتبار مجموعی ''سیتا ہرن'' اپنے موضوع، کردار نگاری، زبان اور اسلوب کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اور اسی لیے اس کا شمار قرۃ العین حیدر کی نمائندہ تحریروں میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

اہم فکشن نگار

نوارالحسنین

کا

نیا ناول

تلک الایام

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز، دہلی ۹۵

مضمون

شمس کمال انجم

عربی میں آزاد شاعری کا موجد کون؟

عربی کا گلشن شعر وسخن زمانہ جاہلیت سے ہی تابدار رہا ہے۔اس میں ایسے ایسے منفرد وبے مثال گل ولالہ کھلے جن کی خوشبو سے عربی شاعری آج بھی معطر ومعنبر ہے۔ اس میں رئیس المتغزلین استاد الشعراء امرؤالقیس کی بے محابہ غزل کی جھنکار بھی ہے تو عمرو بن کلثوم کے فخریہ قصیدوں کی للکار بھی ہے۔ زہیر بن ابی سلمی کے حکمت بھرے اشعار کے تابدار موتی بھی ہیں تو نابغہ ذبیانی کے شان وشوکت سے معمور مدحیہ قصیدے بھی ہیں۔اس میں حسان بن ثابت کی نعتیہ شاعری کا جلوہ ہے تو جریر وفرزدق اور اخطل جیسے عصر بنی امیہ کے بڑے بڑے شاعروں کی نوک جھوک کی بڑی معیاری اور عظیم شاعری بھی ہے۔اس میں متنبّی جیسا شاعر اعظم بھی ہے تو ابوالعتاہیہ جیسا زاہد خشک بھی ہے۔ اس میں ابونواس جیسا خمریاتی شاعری کا امام بھی ہے تو ابوالعلاء معری جیسا مشکل شاعری کا قائد بھی ہے۔اس میں بشار بن برد جیسا شاعر اعمی بھی ہے تو ابو تمام جیسا علم بدیع کی صنعتوں کو اپنے کلام میں پوری مہارت کے ساتھ برتنے والا شاعر بے مثال بھی ہے۔ الغرض سینکڑوں شعراء صدیوں صدی عربی شاعری کے پرچم تلے اپنے فکر وفن کی نمود کرتے رہے۔اسے خون جگر سے سینچتے رہے۔

جاہلیت سے لے کر عصر اسلامی، اور پھر عصر بنی امیہ اور پھر عصر بنی عباس سے ہوتے ہوئے شعر وسخن کا یہ قافلہ جب عصر جدید کی چمکتی دمکتی شاہراہوں پر پہنچا جہاں عربی ادبیات کا یورپی ادبیات سے ملن ہوا، جہاں عرب وعجم کے ادبی ورثے کا اختلاط ہوا اور باہمی اخذ وعطا اور لین دین کی راہیں ہموار ہوئیں تو عربی شاعری نے روایتی حدود وقیود کو توڑتے ہوئے عربی شاعری کی ہیئت میں جدت کا مظاہرہ کیا اور جہاں شاعری میں وزن وقوافی کے اصنام کو توڑنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا اب وہیں شاعری کے نئے قصر تعمیر ہونے شروع ہوئے اور شاعری کو عروضی بندشوں سے چھٹکارا دلانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ردیف وقافیے کی بیڑیوں سے نکل کر ’’آزاد شاعری‘‘ کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۹۴۷ء کا سال اس معنی میں بڑا معنی خیز اور تاریخی رہا کہ ایک طرف ہندوستان میں استعماری طاقتوں سے آزادی کی تاریخ رقم کی گئی تو دوسری طرف نازک الملائکہ اور بدر شاکر سیاب نے عراق میں الکولیرا (کالرا، ہیضہ) اور ’’ھل کان حبا‘‘ نامی قصیدوں کے ذریعے عربی شاعری کو کلاسیکی بیڑیوں سے آزاد کرنے کی بنیاد رکھنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مصر میں لویس عوض، علی احمد باکثیر اور ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی عروضی پابندیوں اور ہٹ کر اور فراہیدی اصولوں سے نکل کر شاعری کی کوشش کر چکے تھے۔ عراق کے عظیم شاعر جمیل صدقی زہاوی نے نظم معرا لکھنے کا اعلان عام کر دیا تھا۔ان سے پہلے خلیل شیبوب، محمود حسن اسماعیل، صالح جودت، سحرتی اور ڈاکٹر ابوشادی وغیرہ نے آزاد نظم کے پیرائے میں نظمیں لکھی تھیں۔ڈاکٹر ابوشادی کا قصیدہ ’’فنان (ہیرو) اور الکرامہ‘‘ (کرامت)، سحرتی کا قصیدہ ’شعلة الحياة‘ (شعلۂ زندگی) مجلّہ الامام میں دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے۔ صالح جودت کا قصیدہ یومان (دودن) مجلّہ ابولو دسمبر ۱۹۳۴ء میں، محمود حسن اسماعیل کا قصیدہ ماتم الطبیعة (ماتم فطرت) مجلّہ ابولو دسمبر ۱۹۳۳ء میں تو خلیل شیبوب کا قصیدہ الشراع (کشتی)

مجلّہ ابولودسمبر۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان قصیدوں پر آزادنظم کامکمل اطلاق نہیں کیا گیانہ ہی ان لوگوں نے آزادنظم (الشعر الحر) لکھنے کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ نازک الملائکہ نے ۱۹۴۷ء کےاواخر میں الکولیرا (ہیضہ) نامی قصیدے کی تخلیق کے بعد ''آزادنظم'' کاموجد ہونے کادعویٰ دائرکردیا۔

نازک الملائکہ کے قصیدۂ الکولیرا کا شان نزول بھی عجیب وغریب ہے۔ کہاجاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے اخیر میں مصر میں ہیضہ کا وبائی مرض پھیل گیا۔ پورا پورا گاؤں اس وبائی مرض کا شکار ہوااور سیکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ نازک اس حادثہ سے بے حدمتاثر ہوئی اوراس نے ایک قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ کلاسیکی انداز میں لکھا تھا مگر ہر چارشعر کے بعد قافیہ بدل جایا کرتا تھا۔قصیدہ پورا کرنے کے بعد جب نازک نے اسے پڑھاتو اسے محسوس ہوا کہ وہ جوکچھ کہنا چاہتی ہے وہ کہہ نہیں سکی۔لہٰذا کچھ دنوں کے بعداس نے ایک دوسری بحر میں دوسرا قصیدہ لکھنا چاہا مگراس باربھی وہ اپنی کوشش سے مطمئن نہیں ہوئی۔ اسے بڑاافسوس اورغم لاحق تھا کہ وہ اپنے جذبات کا صحیح طور سے اظہار نہیں کر پارہی ہے۔ یوں ہی افسوس اور غم میں اس کے دن گزرر ہے تھے کہ ۲۷/اکتوبر کو جمعہ کے روزاس کی نیند کھلی تو وہ سستی اور کاہلی کی وجہ سے بستر پر پڑی رہی۔ ادھر قصیدے میں اپنے احساسات کوصحیح طور سے قلمبند نہ کرپانے کی ناکامی کااحساس تھا تو دوسری طرف ہیضہ کے وبائی امراض سے لوگوں کی موت کاغم۔اسی ادھیڑبن میں وہ مشغول تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے تخیل سے کچھ مصرعے جھانکنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ اچانک اپنی چارپائی سے اٹھی اوربغل میں تعمیر کی جانے والی ایک دومنزلہ عمارت میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئی جہاں جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے کام نہیں ہورہا تھااور سنسان پڑا تھا۔ یہاں اس نے لکھنا شروع کیااورآدھے گھنٹے میں 'الکولیرا' کےعنوان سے پورا قصیدہ لکھ ڈالا۔قصیدہ پورا ہوتے ہی وہ اچھل پڑی اوراپنی چھوٹی بہن احسان کوآواز دی۔احسان یہ دیکھو میں نے عجیب وغریب قسم کا قصیدہ لکھا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ قصیدہ پورے عرب میں ہنگامہ برپا کردے گا۔اس قصیدے کوسب سے پہلے احسان نے پڑھا۔اس کے بعد اس نے اسے اپنی ماں کودکھایا۔اس کی ماں نے کہا یہ کیسا قصیدہ ہے ؟ اس کا وزن تو عجیب سا ہے، اس میں موسیقیت بھی نہیں پائی جاتی، یہ شعر نہیں بکواس ہے۔اس کے والد نے بھی یہ قصیدہ پڑھااور اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ پورے گھر میں عجیب سا ماحول پیدا ہوگیا تھا،اس کے والدین اس کی اس کوشش سے ناخوش تھے۔اس کے بھائی بہن اس کی اس کوشش پر ہنس رہے تھے۔اس نے اپنے والد سے کہا:''آپ جوبھی کہیے مجھے یقین ہے یہ قصیدہ ایک دن عربی شاعری کو بدل کررکھ دے گا'' اس کے بعداس نے سارے لوگوں کا چیلنج قبول کرتے ہوئے اسی انداز کے اورقصیدے لکھے اور پابند شاعری تقریباً چھوڑ دی۔اس نظم کاایک بندآپ بھی ملاحظہ کریں ؎

طَلَع الفَجرُ
اصغِ اِلَی وَقع خُطی المَاشِینَ
فِی صَمتِ الفَجرِ،
اصغِ، اُنظُر! رَکبَ البَاکِینَ
عَشرۃُ اَمواتٍ، عِشرونَا
لاتُحصَی
اِصغِ لِلبَاکِینَا
اِسمَع صَوتَ الطّفلِ المِسکین
مَوتَی، مَوتَی
ضَاع العَددُ
مَوتَی مَوتَی

لَم يَبق غَدُ

فِي كُل مَكان جَسدٌ يندبُه مَحزُون

لالَحظَة اخلاد لا صَمت

هَذا مَا فَعلتْ كفُ المَوت

الموتُ الموتُ الموتُ

تَشكُو البَشريّة تَشكُو المَوت

(صبح ہوئی، ان چلنے والے قدموں کی آہٹ سنو!

سنو! اس صبح کے سناٹے میں

دیکھو! رونے والوں کی ٹولیوں کو

دس موتیں نہیں بلکہ بیس

کتنی موتیں ہوئیں

ان کا شمار مشکل ہے

بس رونے دھونے والوں کا بین سنو

بے چارے بچوں کی چیخ سنو

ادھر بھی لاشیں، ادھر بھی لاشیں

گن نہیں سکتے

لاشیں ہی لاشیں

اب کل نہ ہوگی

ہر طرف بس لاش دکھائی دیتی ہے اور آنکھیں آنسو بہارہی ہیں

ایک پل کے لیے قرار نہیں۔ ایک لمحے کے لیے سکون نہیں۔ ہر طرف آہ و بکا ہے

یہ موت کا ظالم پنجہ ہے

موت! موت! ہر طرف موت دکھائی دیتی ہے

پوری انسانیت شکوہ کناں ہے کہ موت کا یہ خونی پنجہ کس کو چھوڑے گا)

اس قصیدے نے پورے عرب میں ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ کسی نے کہا اس میں وزن نہیں۔ کسی نے کہا اس میں قافیہ ندارد ہے۔ کسی نے کہا یہ تو نثری نظم ہے۔ کسی نے کہا اس میں شعریت نہیں۔ کسی نے کہا اس کے الفاظ وتراکیب بھی رکاکت آمیز ہیں۔

نازک الملائکہ نے اپنے قصیدے کے ذریعے نہ صرف آزاد شاعری کی ایجاد کا دعویٰ کیا بلکہ 'قضايا الشعر المعاصر'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر آزاد شاعری کے خدوخال کی تشریح وتوضیح بھی کر ڈالی۔ دوسری طرف کئی بڑے بڑے ادبا وشعرا سامنے آئے اور آزاد شاعری کو یکسر مسترد کردیا۔ مشہور ناقد عباس محمود عقاد نے آزاد شاعری کو شعر کی صنف ہی سے خارج کردیا تو ڈاکٹر شوقی ضیف نے کہا کہ اگر اس صنف میں شاعری کرنے والوں نے اس کو متعدد قسم کے صوتی آہنگ سے مزین کر کے قافیے کی موسیقیت کے فقدان کی تلافی نہیں کی تو یہ دیرپا ثابت نہیں ہوگی کیونکہ غنائیت اور موسیقیت ہی عربی شاعری کو دنیا کی اور زبانوں کی شاعری سے ممتاز بناتی ہے۔

اسی سال یعنی ۱۹۴۷ء ہی میں سرزمین عراق سے ''ازهار ذابلہ'' کے نام سے ایک اور شعری مجموعے کی اشاعت عمل میں آئی جس کے خالق کا نام بدر شاکر السیاب تھا۔ بدر شاکر نازک سے تین سال چھوٹا تھا۔ اس کے اس مجموعے میں بھی اسی انداز کی شاعری پیش کی گئی تھی۔ اسی میں 'هل كان حبا' کے عنوان سے وہ قصیدہ بھی شامل تھا جو آزاد شاعری کے فارم میں لکھا گیا تھا۔ ابھی لوگ آزاد شاعری کو ہضم نہیں کر پار ہے تھے کہ بدر شاکر سیاب کے اس شعری مجموعے کی اشاعت کے ساتھ عراق کی ادبی فضا میں یہ بات موضوع بحث بن گئی کہ آخر ''آزاد شاعری'' کا خالق کون ہے؟ نازک نے قصیدہ 'الكوليرا' کے

ذریعے اس انداز کی شاعری میں سبقت کی ہے یا بدر شاکرالسیاب نے اپنے قصیدے 'ھل کان حبا' کے ذریعے؟

جلال خیاط کا خیال ہے کہ نازک کے قصیدۂ الکولیرا سے پہلے بدرشاکر سیاب کا مجموعہ ازھار ذابلۃ شائع ہوگیا تھا جس میں ھل کان حبا نامی قصیدہ شامل تھا اس لیے بدرکو نازک پر سبقت حاصل ہوئی۔مگر مشہور ادیب وناقد ڈاکٹر احسان عباس صاحب کے خیال میں نازک الملائکہ کو اس میں سبقت حاصل ہے اور جلال خیاط کے قول کو صحیح ہونے کی صورت میں وہ دونوں کو ہی اس حوالے سے اہم مانتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ آج تک عرب نقاد اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ آزاد شاعری لکھنے میں کس کو سبقت حاصل ہے۔

بہرحال آزادشاعری کا موجد خواہ نازک الملائکہ کو تسلیم کیا جائے یا بدرشاکر سیاب کو ایک بات تو اظہر من الشمس ہے کہ نازک اور بدرشاکر نے جس آزادشاعری کی بنیاد ڈالی تھی آج بھی وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود پوری رفتار کے ساتھ محوسفر ہے۔نازک اور بدر کے بعد عالم عرب کے ہر ملک میں ایسے شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے پوری شدت کے ساتھ آزادشاعری کا پرچم بلند رکھا۔ عراق میں عبدالوہاب بیاتی، مصر میں صلاح عبدالصبور، احمد عبدالمعطی حجازی، لبنان میں ادونیس اور خلیل خاوی، شام میں نزار قبانی، فلسطین میں فدوا طوقان، محمود درویش، سمیح القاسم، وغیرہ نے آزاد شاعری کے فارم کو نہ صرف اپنایا بلکہ اتنی شدومد کے ساتھ اس فارم میں کلام تخلیق کیا کہ انہیں عالم عرب میں آزادشاعری کا قائد اور رہنما تسلیم کیا جانے لگا۔عالم عرب سے مہاجرت کرکے امریکہ کی نئی بستیوں میں آباد ہونے والے مہجری شاعروں نے دوقدم آگے بڑھ کر اس فارم کا تجربہ کیا۔بلکہ بعض شاعروں نے تو پیرامڈ (اہرام) کی شکل میں شاعری کی اور کہا کہ پہلے مصرعے میں ایک رکن، دوسرے میں دو رکن اور تیسرے میں تین تو چوتھے اور پانچویں مصرعوں میں چارچار اور پانچ پانچ رکن ہوں اور اس کے بعد کے مصرعوں میں بالکل اس کے برعکس چار، تین، دو اور ایک رکن کا التزام کیا جائے۔اس طرح عربی میں آزادنظم نگاری کا کارواں آج بھی محوسفر ہے۔

☆☆☆

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس' کے شمارے پڑھے جاسکتے ہیں۔صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جاسکتا ہے۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

گلشن آرا

مضمون

بیدی کے افسانوں میں عورت

بقول پروفیسر وہاب اشرفی۔

راجندر سنگھ بیدی نے زندگی کی بڑی اونچ نیچ دیکھی۔ پنجاب کے خوشحال قصبوں اور بدحال لوگوں کی بپتا، نیم تعلیم یافتہ حلقوں کی رسمیں، رواداریاں، کشمکش اور نباہ کی تدبیریں، پرانی دنیا نئے خیالات کی آمیزش، نئی نسل اور اردگرد کے بندھنوں کی آمیزش۔ ان سب میں بیدی نے دہشت کی بجائے نرمیوں کو چن لیا۔

''نرمیاں'' اپنے پورے اور سنجیدہ مضمون کے ساتھ اُن کا مطالعہ کائنات کا اصل اصول اور مرکزی نقطہ ہے۔ بھیانک میں بھلمنساہٹ کو اور ناگواریوں میں سے گوارہ کو تلاش کرنا ان کے اندر فنکار کا اصل گُر تو یہ ہے بیدردی سے دیکھنا، بے دردی سے کریدنا، برتنا اور دردمندی سے ان کو کاغذ (سلولائیڈ) پر اُتار دینا۔

اس دکھی آتما کو ایک بڑا کارنامہ ہے جو منفرد بھی ہے اور شاداب بھی۔ اردو فکشن کی تاریخ میں بیدی کا نام نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ راجندر سینگھ بیدی کی پیدائش یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور میں ہوئی۔ جہاں ان کے والد ہیرا سنگھ بیدی ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ مگر ان کا اصل وطن سیال کوٹ ہے۔

بیدی نے ۱۹۳۱ء میں خالصہ اسکول سے میٹرک کیا اور لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی کالج سے انٹر کرنے کے بعد بی اے میں داخلہ لیا لیکن کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ انہوں نے آگے کی تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ صرف ۱۹ رسال میں ان کی شادی ستونت کور سے ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں بیدی کی ملازمت کا دور شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں بیدی لاہور پوسٹ آفس میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے۔ دس سال تک ڈاکخانے کی ملازمت کرنے کے بعد استعفیٰ دے کر دہلی میں مرکزی حکومت کے پبلسٹی شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی صرف چھ ماہ سے زیادہ نہیں چل سکا اور پھر بیدی لاہور ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ملک کے بٹوارے کے عظیم سانحہ کے بعد دہلی آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں بیدی ادیبوں اور دانشوروں کے ایک وفد کے ساتھ کشمیر گئے جہاں شیخ عبداللہ نے بیدی کو جموں کشمیر ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا۔ بیدی ہی کی کوششوں اور کاوشوں سے سری نگر ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔ کشمیر میں بیدی کا قیام صرف ایک ہی سال رہا۔ بخشی غلام محمد سے شدید اختلاف کی وجہ سے ۱۹۴۹ء میں بیدی کشمیر سے دہلی ہوتے ہوئے ممبئی وارد ہوئے اور پھر ممبئی ہی میں ان کا مستقل قیام رہا اور اسی سرزمیں بیدی کا ۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء کو انتقال ہوا۔

بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ ابتدا میں محسن لاہوری کے فرضی نام سے تخلیقات شائع ہوئے اور پھر بہت جلد انہوں نے اپنے اصل نام راجندر سنگھ بیدی کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ بیدی کا پہلا رومانی افسانہ بعنوان ''مہارانی کا تحفہ'' کے نام سے لاہور کے ادبی دنیا میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد بیدی کے افسانوں نے ایک نئی کروٹ لی۔ بیدی کے یہاں ایک نیا رنگ و آہنگ اور نئی تازگی و توانائی ان کے یہاں پیدا ہوا۔ اب بیدی کے افسانوں میں رومانیت کی جگہ متانت و سنجیدہ حقیقت نگاری نے لے لیا۔ سن ۱۹۳۶ء میں بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ''

دانہ ودام'' مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوا۔ کُل ۲۲۴ صفحات پر مشتمل افسانوی مجموعہ میں کُل ۱۴/ افسانے شامل ہیں '' بھولا، ہمدوش، من کی من میں، گرم کوٹ، چھوکری کی لوٗٹ، پان شاپ منگل اشٹکا، کوارنٹین، تلاوان، دس منٹ بارش میں، وٹامن بی، لچھمن، ردِ عمل اور موت کا راز'' یہ تاریخی صداقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ '' انگارے'' (۱۹۳۲) کی اشاعت، ترقی پسند ادبی تحریک (۱۹۳۶) اور پریم چند کا وہ تاریخی خطبہ صدارت کا جملہ '' ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' یہ تمام باتیں بیدی کے پیش نظر تھیں۔ بیدی کا دوسرا افسانوی مجموعہ '' گرہن'' پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں نیا ادارہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ۲۰۸ صحات کے اس کہانی کے مجموعہ میں کُل ۱۴ /افسانے شامل تھے۔ پیش لفظ '' گرہن، رحمٰن کے جوتے، بکی، اغوا، غلامی، ہڈیاں اور پھول، زین العابدین، لاروے، گھر میں بازار میں، دوسرا کنارہ، آلو، معاون اور میں، چیچک کے داغ، ابوالانس۔'' بیدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ '' کوکھ جلی'' مارچ ۱۹۴۹ء میں کتب پبلشرز ممبئی نے شائع کیا، ۲۲۱ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں '' لمس، کوکھ جلی، بیکار خدا، نامراد مہاجرین، کشمکش، ایک عورت، ٹرمنس، گالی، خطِ مستقیم اور قوسیں، مالوا، آگ، جب میں چھوٹا تھا (ایک مطالعہ) شامل ہیں۔ بیدی کا چوتھا افسانوی مجموعہ '' اپنے دکھ مجھے دے دو'' ۱۹۶۵ء میں مکتبہء جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ ۲۶۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں لاجونتی، جوگیا، ببّل، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو۔ ٹرمنس سے پرے، حجام الٰہ باد کے، دیوالہ، یوکلپٹس، کل نو افسانے شامل ہیں۔

بیدی کا پانچواں افسانوی مجموعہ '' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے مارچ ۱۹۷۴ء میں مکتبہء جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں دس افسانے شامل ہیں، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، (ایک اعتراف)، صرف ایک سگریٹ، کلیانی، متھن، باری کا بخار، سونفیا، وہ بڈھا، جنازہ کہاں ہے، تعطّل، آئینے کے سامنے۔ مکتی بودھ بیدی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں مکتبہء جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں کل ۱۲ /افسانے شامل ہیں، افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل '' مکتی بودھ، ایک باپ بکاؤ ہے، چشمِ بددور، لولو، بلی کا بچہ، خواجہ احمد عباس، چلتے پھرتے، بیوی یا بیماری، مہمان، فلم بنا کھیل ہیں، گیتا۔

راجندر سنگھ بیدی نے ایک ناولٹ '' ایک چادر میلی سی'' لکھا جسے ۱۹۶۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بیدی نے کئی یک بابی ڈرامے بھی لکھے '' سات کھیل (۱۹۴۶) اور بے جان چیزیں (۱۹۴۳) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ بیدی نے کئی فلموں کے مکالمے اور منظر نامے بھی لکھے خود بھی کئی فلمیں بنائیں جن میں دستک اور '' پھاگن'' مشہور ہیں۔ بیدی کی اہلیہ ستونت کور کا ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔ اہلیہ کی موت نے بیدی کو توڑ دیا۔

۱۹۷۹ء میں بیدی پر فالج کا حملہ ہوا۔ چلنے پھرنے سے بھی بیدی معذور ہو گئے۔ اور آخر کار ۱۱/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اردو فکشن کا درخشندہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بیدی کو پدم شری کے علاوہ ساہتیہ اکادمی، مرزا غالب ایوارڈ اور کئی دوسرے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا، بیدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانے کو سنجیدگی اور متانت سے قریب تر کیا۔ زندگی کی زمینی حقیقتوں کو ایک نئے سرے سے دریافت کرنے کی مخلصانہ کاوش کی۔ پریم چند کی عظیم افسانوی روایت اور ترقی پسندانہ افکار وخیالات کو نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں کے ذریعے ایک نئی سمت اور دشا سے روشناس کرایا۔ بقول پروفیسر قمر رئیس۔

جب پریم چند جیسی عمر اور مرتبہ کے ادیب اس تحریک کو

فروغ دینے میں ایسے والہانہ شغف سے کام کر رہے تھے تو دوسرے نوجوان ادیب کیسی لگن اور دلچسپی سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہونگے۔ ایک سال بھی مشکل سے گذرا تھا کہ کرشن چندر، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، مجاز، جذبی، سید احتشام حسین، مخدوم معین الدین، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، کیفی اعظمی، اور سبط حسن جیسے باصلاحیت ادیب اس تحریک میں شامل رہے اور اس کے جلسوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

بیدی اردو فکشن کا ایک ایسا محبوب اور معتبر نام ہے جن کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔ کئی رسالوں نے گوشے اور نمبر شائع ہوئے کئی تحقیقی وتنقیدی مقالے بھی قلمبند کئے گئے۔ انہوں نے جو کچھ بھی اردو فکشن کو دیا اپنے اصولوں اور اپنی شرطوں پر دیا۔ عجلت پسندی کا نام ونشان ان کے اافسانوں میں کہیں نہیں نظر آتے۔ جس موضوع پر بیدی نے قلم اُٹھایا اس کے تمام پہلوؤں پر نہایت سنجیدگی سے غور وفکر بھی کیا۔ جیسا کہ نامور فکشن نگار جوگندر پال نے کہا۔

''بیدی سورج سوچ کر لکھنے کا عادی ہے اور اس کا قاری بھی سوچوں کے گھیرے میں آ کر اُسے رُک رُک کر پڑھتا ہے۔ گویا کہانی کو اپنے طور پر تخلیق ہوئے آگے بڑھ رہا ہو، قاری کے لئے کھوج کی یہ گنجائش روا رکھ کر بیدی نے ایک طرح سے مطالعہ کو تخلیق کی سرحدوں سے جوڑ دیا ہے۔

بیدی اپنے تمام پڑھنے والوں کو دعوت غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات اور ان کے جذبات اور احساسات پر ان کی بھر پور گرفت ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے ارد گرد خود کو قریب تر کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ عورتوں کی نفسیات کے حوالے سے بیدی کا مقام ومرتبہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے کرداروں کے ساتھ بھر پور انصاف کرتے ہیں۔ عورتوں کی نفسیات کی تہوں میں جا کر ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ بقاول نامور فکشن نگار، ناقد پروفیسر وقار عظیم کے لفظوں میں ۔

''بیدی کے افسانوں میں بھی بہت سی جگہ عورت نظر آتی ہے لیکن ان کے یہاں دو ایک موقعوں کو چھوڑ کر 'عورت صرف رومان کا دوسرا نام نہیں عورت کے تصور کے ساتھ رومان کا جو قدرتی جذبہ موجود ہے اس کا احساس بیدی کو بھی شدّت سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو چیز برابر اس تصور کی ہم عناں کرتی ہے وہ دنیاوی حقائق ہیں۔ وہ عورت اور اس کے رومان ان تعلقات کی فضا میں رہ کر دیکھتے دکھاتے ہیں جن کے بغیر عورت کی فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی عورت ماں ہے بیوی ہے بہن ہے اور اس کے علاوہ اس کے دم سے دنیا کے بہت سے رشتے ناتے ہیں (نیا افسانہ ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ بیدی نے عورت کو عورت کی نفسیات، صفات، کردار، حرکات وسکنات بلکہ ان تمام پہلوؤں کو بہت گہرائی وگیرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ایک مکمل عورت کی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے عورت کی تخلیق کائنات کا ایک حسین، عظیم کارنامہ ہے بقول علامہ اقبالؒ ۔

''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''

لاجونتی، جوگیا، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو، گرم کوٹ، دیوالہ وغیرہ افسانوں میں جس طرح بیدی نے عورت کی نفسیاتی کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ اردو افسانے میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

''بیدی کے فن میں استعارہ اور اساطیری تصورات کی بنیادی اہمیت ہے۔ اکثر وبیشتر ان کی کہانی معنوی ڈھانچہ دیو

مالائی عناصر پر ٹکا ہوا ہے۔لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ شعوری یا ارادی طور پر اس ڈھانچے کو خلق کرتے ہیں اور اس پر کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں بیدی کا تخلیقی عمل کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ اپنے کردار اور اس کی نفسیات کے ذریعہ زندگی کے بنیادی رازوں تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں، جبلتوں کے خود غرضانہ عمل جسم کے تقاضوں اور روح کی تڑپ کو وہ صرف شعور کی سطح پر نہیں بلکہ ان کی لاشعوری وابستگیوں اور صدیوں کی گونج کے ساتھ سامنے لائے ہیں ۔ جس عہد میں بیدی افسانے لکھ رہے تھے پریم چند حیات سے تھے اور کئی نام اردو فکشن کے افق پر نمودار ہو رہے تھے۔کرشن چندر، حیات اللہ انصاری سہیل عظیم آبادی، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، دیوندر ستیارتھی، اور کئی دوسرے نام منظرِ عام پر آرہے تھے۔ بیدی کے پیش نظر وہ تمام افسانوی حالات سامنے تھے۔پنجاب کے کھیت کھلیان سے لے کر وہاں کے امیروں اور غریبوں کے طرز زندگی کو بیدی نے نہ صرف یہ اس کا قریب سے مطالعہ کیا بلکہ ان حالات کے اسباب میں اترنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔اس لئے بیدی کو اپنی ایک مخصوص ومنفرد پہچان آج بھی قائم ہے۔ بیدی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس ادبی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کے یہاں فن واسلوب کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کا حسین امتزاج ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔اپنے کرداروں کے ساتھ خلوص ومحبت بیدی کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ وہ ہر جگہ تسلسل، توازن، اور ٹھہراو کو ملحوظ رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں اردو کے افسانوی ادب میں بیدی کا جو خاص مقام ومرتبہ ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے دوش بدوش اور سانسوں میں ان کے کرب وکیفیت کو محسوس کرتے ہیں بقول پروفیسر محمد حسن۔

’’بیدی کا فن رمزیت، تہہ داری اور مدھم لب ولہجے کا فن ہے۔تہہ داری اور رمزیت نفسیاتی دور بینی سے پیدا ہوتی ہے‘‘(شناسا چہرے۔ص ۲۰۸)

بیدی نے غلام ہندوستان کو بھی اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور آزاد ہندوستان کے دو دلوں کے ٹکروں سے پنپنے والے حالات کو بھی۔ تقسیم ہند کے زخموں کو پھول میں تبدیل کر کے بیدی نے اردو افسانے کو ایک نئی تازگی اور توانائی سے رو شناس کرایا۔غم وغصہ کی جگہ خلوص ومحبت، نفرت، ظلم وزیادتی کی جگہ انسانی قدروں کو نئے سرے سے دریافت کرنے کی مخلصانہ کاوش کی۔ بیدی جس درد وداغ کو سینے میں لئے تخلیقی ادب کے بنیادی خوشبوؤں کو اُجاگر کر رہے تھے وہ انہیں کا کلیجہ تھا ورنہ اس عہد کے کئی ادیب وشاعر اپنی دیرینہ عظیم روایت کو فراموش کر چکے تھے۔

جناب کیفی اعظمی بیدی کے افسانوی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں ۔’’بیدی صاحب کی شخصیت کو ان کے فن سے الگ کر کے دیکھنا میرے لئے مشکل ہے۔ بیدی صاحب کی شخصیت میں جو گداز ہے، جو نرمی ہے، جو لطافت ہے وہی ان کے فن میں ہے۔میں نے اتنی مطابقت اتنی ہی کم دیکھی ہے جتنی ان کے فن اور ذات میں ہے۔

دراصل بیدی کے تمام افسانے انسانی قدروں کے ارد گرد گھومتے اور رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ انسانی نفسیات اور عورتوں کے جذبات واحساسات کو بیدی کچھ اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ کردار ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ اور ہم اس سے ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ تقسیم ہند کے پسِ منظر میں رونما ہونے والے حالات پر مبنی لاجونتی ہو یا پھر گرم کوٹ کی چاہت اور جستجو کے کرب واضطراب ان تمام مرحلوں سے خود گذرنے اور قاری کو گذارنے پر کامیاب

ہو جاتے ہیں۔انسانی قدروں، زمینی حقیقتوں اوران کے مسائل و معاملات کونہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بیدی اپنے افسانوں میں برتنے اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں ٹوٹتے بکھرتے رشتوں اور دم توڑتی ہوئی انسانیت،زوال آمادہ ذہنیت میں انسانیت کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہیں چھوڑتے ،آخری دم تک بیدی کاقلم انسانیت کی حفاظت اور قدروں کی پاسداری ان کامشن اورمقصد رہا جیسا کہ نامورناقد پروفیسرآل احمد سرور لکھتے ہیں۔

''راجندرسنگھ بیدی ایک ایسے فنکار ہیں جو آدمی کے تمام معاملات کے بارے میں نہایت باخبر، ذی عقل، دانشمند اورطباع ہیں وہ انسانی امور کوسم، جھنے کا ہنر جانتے ہیں اوراس راہ سے بھی واف ہیں جس پر چل کرآدمی کے ساتھ بہتر استوار کیا جاتا ہے۔آدمی شناس اورخلوص کے باعث انہیں ایک فقیرانہ تقدس حاصل ہے۔''

اردو کے افسانوی روایت میں بیدی ایک ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں نے اردوافسانہ میں فن اسلوب اور کردار کونہایت ہی خوش اسلوبی اورخوبصورتی سے پیش کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔وہ اردو کے ان معدودے چند فکشن نگاروں میں ہیں جنہوں نے اردوافسانہ کو ایک نیاوقار، معیاراوراعتبار بخشنے کا کام کیاان پر بہت کچھ ان کی زندگی میں لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے اور بیدی اردوافسانے کا ایک ایسا نام ہے جسے ہم کسی طورفراموش نہیں کر سکتے۔ان کے افسانے پڑھنے والوں کا دیراور دورتک ساتھ رہتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ان کا انسان اورانسانیت پرحد درجہ ایمان اوربھروسا آخری دم تک زندہ رہا۔

بیدی کے افسانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے معروف ناقد باقرمہدی لکھتے ہیں۔

''بیدی نے اپنے افسانہ نگاری میں کردار نگاری کو بڑی اہمیت دی ہے مگر وہ منٹو کی طرح اپنی کردارنگاری کا سارابوجھ ان کے کندھوں پرنہیں ڈالتے بلکہ اس کو کہانی میں ''اہم جزو'' کی حیثیت ہی دیتے ہیں اس طرح کردار کے سہارے کے باوجود کہانی کی ساری اساس اس پر نہیں رہتی۔(آگہی وبے باکی۔۱۹۴)

☆☆☆

اہم فکشن نگار

حسین الحق

کا

نیاناول

اماوس میں خواب

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

مضمون

عبد الحلیم انصاری

آزادی کے بعد مغربی بنگال کے ادب پر تحریکات کا اثر

آزادی کے بعد مغربی بنگال کا اردو ادب مختلف تحریکات ونظریات سے متاثر ہوا۔۱۹۴۷ء میں ملک کے آزاد ہونے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے عام انسانوں کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا۔۱۹۳۶ء میں ادب میں باقاعدہ ترقی پسندی نے اپنے قدم جمائے اور تقریباً ۱۹۵۵ء تک اردو شعروادب کو متاثر کیا۔اسی دور میں افسانوں اور شاعری میں اشتراکی نظریہء حیات اور نظریہء سیاست کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادیبوں اور شاعروں کے لئے کچھ رہنما اصول وضع کئے تھے جن کے تحت ہی ادیبوں کو ادب کی تخلیق کرنا تھا۔انجمن کے مطابق ادب میں دقیانوسی خیالات اور مذہبی تنگ نظری سے اجتناب کیا جائے اور عوام کے مسائل،انکے ساتھ ہونے والی ناانصافی،زیادتیوں اور سماج کے غلط رسم ورواج کے خلاف صدائے بغاوت بلند کی جائے۔سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کے استحصال اور سامراجی ملک کے غیر قانونی قبضے کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کی جائے اور تحریک آزادی کو قوت بخشنے والی تحریریں پیش کیں جائیں۔پریم چند ترقی پسند تحریک کے سب سے بڑے علمبردار بن کر ابھرے اور انہوں نے ترقی پسندی کی تحت افسانہ ''کفن'' اسی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں لکھا جو اردو افسانے میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے علاوہ سدرشن،حیات اللہ انصاری،اعظم کریوی،علی عباس حسینی وغیرہ نے بھی اردو افسانے میں ترقی پسندی کو فروغ دیا۔

مغربی بنگال کے ادب پر بھی اس تحریک کا اثر پڑا اور یہاں اس تحریک کا زور لمبے عرصے تک رہا۔آزادی کے بعد مغربی بنگال میں جن افسانہ نگاروں نے ترقی پسندی کے تحت افسانے لکھے ان میں جاوید نہال،سالک لکھنوی،شائستہ اختر،شانتی رنجن بھٹاچاریہ،نشاط الایمان،عابد ضمیر،نذیر احمد یوسفی،شمس ندیم،سعید پریمی حسن نجمی سکندر پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔۱۹۵۰ء تک آتے آتے بنگال میں اردو افسانے نے فنی اور فکری پختگی حاصل کر لی۔منشی پریم چند کے زیر اثر سرمایہ دارانہ نظام کا ظلم و جبر،بھوک افلاس،تنگدستی،فرقہ پرستی،سماجی برائیاں مثلاً جہیز،کمسنی کی شادی،عورت کی مظلومیت،اور مفاد پرست سیاست اس دور میں بنگال کے موضوعات تھے۔۱۹۵۰ء کے بعد بنگال کی سیاسی فضا میں ٹھہراؤ آ گیا اور ادب میں اس دور کے مسائل کا عکس صاف اور واضح ہونے لگا۔

اس دور میں رومانی افسانے بھی لکھے جا رہے تھے مگر ترقی پسندی کا اثر غالب تھا اور ایک ادبی نظریئے کی حیثیت سے ترقی پسند تحریک افسانوں کی رہنمائی کر رہی تھی۔اس دور میں جو قابل ذکر افسانے بنگال میں لکھے گئے ان میں جاوید نہال کا'' پھول رانی''،سہیل واسطی کا'' شانتی پیدا ہوئی''،شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا افسانہ ''ننگا'' عصری حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں بنگال کے عوام کے مسائل،یہاں کی تہذیب وثقافت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔سہیلؔ واسطی کے افسانے'' شانتی پیدا ہوئی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس کے بعد والا سال بنگال پر جس طرح مسلط ہوا وہ تو آپ جانتے ہی ہونگے۔جیسے قحط کے مردار خور گدھ نے اپنے مکروہ پر پھیلا دیئے ہوں۔مانڑ کا ایک کٹورہ اور اس کی قیمت آٹھ

سے پانچ سیر چاول اور اس کا معاوضہ ایک دوشیزہ کا سانس لیتا ہوا ایسا جسم جس پر دو سال کے اندر گوشت چڑھ جانے کی امید ہو، یقین ہو کہ زیادہ سے زیادہ دو سال میں باہیں سڈول ہو جائینگی، سینہ گداز ہو جائیگا، کولہا پھیل جائیگا۔ وہ جسم ایسا ہو جائیگا کہ کھڑکی سے اس کی جھلک دیکھ کر سوناگاچھی کی سڑک پر چلتا ہوا راہ گیر لمحہ بھر کو رک کر اپنی جیب کا جائزہ لینے لگے۔''

اس دور کے افسانوں میں چھوا چھوت اور اونچے طبقے کا نچلی ذات پر ظلم اور امتیازی سلوک کا بھی ذکر آتا ہے۔ چھوا چھوت پر سالک لکھنوی کا افسانہ ''اچھوت'' قابل ذکر ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماں اپنے سوامی کے پاس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ لڑکی سے پانی مانگا۔ گھر میں پانی نہ تھا۔ اُس نے گھڑا اُٹھایا اور کنویں کی طرف چلی۔ برہمن مہاشئے کھڑے نہارے تھے۔ اس نے گھڑا آگے بڑھا دیا۔ اور تھوڑا پانی مانگا۔ اس کی ماں مر رہی تھی۔ مہاشئے کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ ایک اچھوت لڑکی کو وہ اپنے ہاتھوں سے پانی کیونکر دیتے۔ کنواں انکے لئے تھا یا اچھوتوں کے لئے۔

''چل دور ہو۔ انہوں نے ڈانٹ پلائی۔ بے حیا چھوکری۔''

شانتی رنجن بھٹا چاریہ بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کے افسانوں میں بھی محنت کش طبقے کا درد جھلکتا ہے۔ ان کا افسانہ ''امر کہانی نمبر۔ا'' کا ایک اقتباس انکے نظریہ فن کا ترجمان ہے۔

''میں کسان ہوں۔ بہار کا کسان۔ بڑے بھائی غلامی کے دور میں ہی کوچ کر گئے۔ وہ آزاد نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میں خوش قسمت ہوں۔ کیونکہ میں آزاد وطن میں مرا، وطن کے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ ہوا۔ اور صرف اس لئے کہ میں بھوکا تھا۔ آزادی کی موت غلامی کی زندگی سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ میں جاہل ہوں اور آزادی کے بعد میری بھوک دن بدن بڑھتی گئی۔ شاید آزادی بھوک کا نام ہے۔ بڑھی ہوئی بھوک کا۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے بنگال میں ترقی پسند افسانے کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فکری وسعت اور سماجی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس دور کی شاعری پر بھی ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر پڑا تھا۔ قومی سطح پر علی سردار جعفری، فیضؔ، جوشؔ، ساحرؔ لدھیانوی، مجازؔ لکھنوی، جانثار اخترؔ، کیفیؔ اعظمی، مخدومؔ محی الدین اور مجروح سلطان پوری جیسے شعراء نے ترقی پسندی کا علم بلند کر رکھا تھا اور عوام میں جذبۂ بیداری اور سماجی انقلاب کا پیغام دے رہے تھے۔ اسی زمانے میں بنگال میں پرویزؔ شاہدی، وحشتؔ کلکتوی، جمیلؔ مظہری، حرمتؔ الاکرام، اسد الزماں اسدؔ، اویسؔ احمد دوراں، سالک لکھنوی، سہیلؔ واسطی، عبدالرؤف، علقمہ شبلیؔ، جرم محمد آبادی وغیرہ پر مشتمل ترقی پسند شاعروں کی ایک کھیپ تھی جنہوں نے بنگال میں اشترا کی نظریات کے زیر اثر غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ ان شعراء کی غزلوں میں اجتماعی سماجی شعور کا عکس ملتا ہے۔ ظلم، نا انصافی، استحصال اور سماجی برائیوں پر انکے یہاں اشعار ملتے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

مورخ یوں جگہ دیتا نہیں تاریخ عالم میں
بڑی قربانیوں کے بعد پیدا نام ہوتا ہے

(جرم محمد آبادی)

تم اپنے قدموں سے گرد اچھالو، ہماری قسمت پہ خاک ڈالو
ہمارا کیا ہے ہم تو نقش پا ہیں بنا کریں گے مٹا کریں گے

(جمیلؔ مظہری)

غمگیں ہے دل فگار ہیں میرے یہاں کے لوگ
داماں تار تار ہیں میرے یہاں کے لوگ
(اویس احمد دوراں)

جن کی لاشوں پر ہے بنیادِ چمن
باغباں نے اجنبی ٹھہرا دیا
(سہیلؔ واسطی)

جفا کو سامنے رکھ کر وفا سے میری ٹکراؤ
تم اپنا جائزہ لے لو تو لینا امتحاں میرا
(ابراہیم ہوشؔ)

باندھ کر کفن سر سے یوں کھڑا ہوں مقتل میں
جیسے سرفروشوں کا کارواں نہاتا ہے
(پرویزؔ شاہدی)

ترقی پسند شاعری میں اجتماعی مسائل، مفاد عامہ اور ہمت وحوصلہ دینے والے مضامین باندھے جاتے تھے، ظلم وناانصافی سے لڑنے کا عزم ظاہر ہوتا تھا اور ایک مثالی معاشرے کا خواب پیش کیا جاتا تھا۔ ترقی پسندی نے نظم کو غزل کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی اور نظم کی ہئیت کو ترقی پسند دور میں فروغ ہوا۔ بنگال میں بھی نظموں کو اسی زمانے میں فروغ ہوا۔ پرویزؔ شاہدی، وحشت کلکتوی، جمیلؔ مظہری، حرمت الاکرام وغیرہ نے نظموں میں ترقی پسندانہ خیالات وموضوعات کو پیش کیا۔ پرویز شاہدی کی نظم ''بے چہرگی'' ایک شاہکار اور بنگال میں ترقی پسندی کا ایک سنگ میل ہے۔

مگر رفتہ رفتہ ترقی پسندی میں اکتا دینے والی یکسانیت، پرتصنع طرز بیان اور گھسے پٹے خیالات نے شعراء وادباء کو نئے جہانوں کی تلاش پر مائل کیا اور ردِ عمل کے طور پر ادب میں جدیدیت کا دور شروع ہوا۔ پاکستان میں فوجی نظام کے تلے اظہار کی آزادی پر لگنے والی پابندیوں نے بھی جدیدیت کو فروغ دیا اور علامتی طرز بیان کو مقبولیت ملی۔ اس طرح اردو افسانے اور شاعری میں جدیدیت نے جگہ بنالی۔

پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد نے سب سے پہلے علامتی افسانے لکھے اسی دور میں ہندوستان میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش نے علامتی افسانہ نگاری کی شرعات کی۔ بنگال میں بھی انیس رفیع، ظفر اگانوی، عابد ضمیر، سہیلؔ واسطی، شمس ندیم اور جاوید نہال نے علامتی افسانے لکھے۔ ۱۹۶۰ء سے اردو افسانوں میں جدیدیت نے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔ انیس رفیع کا ''سات گھڑے پانیوں والی عورت''، ''اب یہاں گدھ نہیں اترتے'' اور'' اب وہ اترنے والا ہے'' جیسے افسانے نے بنگال میں جدید افسانوں کی روایت کو فروغ دیا۔ ان کے افسانے ''ساتواں بوڑھا'' کا ایک اقتباس ان کے اسلوب اور فکر کا عکاس ہے۔

''اچانک اس بے نام سی جگہ کے ایک دور دراز کونے سے ایک بوڑھی کھانسی کی آواز آئی۔ جانی پہچانی آواز۔ میں بے تحاشہ اس کونے کی اور بھاگا۔ شاید وہ آگئی ہو۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ بے نام سی جگہ کو شاید اب نام ملنے والا ہو۔ وہ ساتواں بوڑھا ہی تھا۔

''تمہاری پیٹھ کا مسافر کہاں ہے بابا۔؟''

''بوڑھے کی نحیف آواز ابھری۔''

''میرے بچے میں ریس میں ہار گیا۔ میری شکست ہوگئی۔ بہت تھک چکا تھا۔ واپس لوٹ آیا۔ کیونکہ اب وہ ساتویں بوڑھے سے نہیں ڈرتی۔ کسی بوڑھے سے نہیں ڈرتی۔

مٹی چاٹنے کو میری زبان باہر نکل آئی مگر مٹی تو تانبا بن چکی تھی۔

جاوید نہال نے بھی اپنے دوسرے دور یعنی ستّر کی دہائی میں کئی عمدہ علامتی افسانے لکھے۔ ان میں '' نیم کا رس''،''

سمندر، لہریں اور مچھلیاں''، '' لہو کا دائرہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں انسانی مسائل اور ذات کے کرب کو خوبصورتی سے تہہ داری اور گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ ظفر اگانوی نے بنگال میں علامتی افسانہ نگاری کو مزید بلندی عطا کی۔ انسانی وجود کے فلسفے پر ان کا افسانہ '' بیچ کا ورق'' کافی مشہور ہوا۔ '' اپنا رنگ'' میں انہوں نے ایک نفسیاتی موضوع کو افسانے کا جامہ پہنایا ہے۔ شمس ندیم کا '' پہرے دار''، اظہار الاسلام کا '' بالشت بھر رات'' اور عشرت بیتاب کا '' نیلی ساڑی'' اور '' ٹھنڈی آنچ کا سورج'' اس دور کے قابل ذکر علامتی افسانے ہیں۔ عابد ضمیر نے بھی چند علامتی افسانے لکھے جن میں '' ڈوبتے سورج کا کرب''، '' ایک مرجھائی ہوئی شاخ کی کہانی '' اور '' دوسرا ستون'' اہم ہیں۔

جدیدت کے زیر اثر جو شاعری ہوئی اس میں سماج کے بجائے فرد کو اہمیت دی گئی۔ جدید صنعتی دور کے مسائل نے افسانوں میں جو خوف، احساس تنہائی اور داخلی کرب میں اضافہ کیا تھا اس کی وجہ سے میں اس میں سماج سے لاتعلقی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اپنی ذات میں سمٹ گیا تھا۔ جدید شاعری جدید انسان کے اسی داخلی و نفسیاتی مسائل کا اظہار ہے۔ اس دور کی شاعری میں زبان اور لہجے کی سطح پر بھی تبدیلی آئی۔ کلاسیکی اور روایتی شاعری کی لفظیات اور اصطلاحات سے یکسر پرہیز کیا گیا اور نئی تشبیہیں اور استعارے تخلیق کئے گئے۔ فطرت کو اس دور کی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار کے لئے پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا۔ لہذا، ہندوستان کی دیگر صوبوں کی طرح بنگال کی شاعری میں بھی جدیدت کا اثر پڑا۔ یہاں کے شعراء نے بھی عالمی سطح پر شاعری میں آنے والی تبدیلیوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔ لہذا، انکی شاعری میں جدیدت کی خصوصیات ظاہر ہوئیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

مسئلوں کی ایک تیز آندھی اور اک سوکھا شجر
خود کو گویا ڈھانپتے ہیں اک پھٹی چادر سے ہم
(فاروق شفق)

میں خود سے دور ہوتی رہی ہوں تیرے لئے
تو میرے پاس ہوکے بھی میرا کہاں رہا
(شہناز نبی)

بدن تک بگولوں کے جھلسا گئی
چلی اس سے پہلے نہ ایسی ہوا
(یوسف تقی)

پی پی کے حادثات کی چھاتی سے پھیکا دودھ
مایوسیوں کی گود میں پلتی ہے زندگی
(اکبر حسین اکبر)

سچ کا پودا لگا کے دیکھ لیا
اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا
(وکیل اختر)

جدید غزل میں موضوعات اور زبان میں کھردرا پن واضح ہے۔ اس دور کے شعراء یہ سمجھتے تھے کہ زندگی اب پہلے جیسی لطیف اور رنگین نہیں ہیں اس لئے جدید غزل کی زبان میں بھی لطافت اور رنگینی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ جدید غزل میں نئی علامتوں کے ساتھ ساتھ ہندو مذہبی موضوعات اور کرداروں کو جگہ دی جانے لگی۔ گل، بلبل، جام و پیمانہ، ابرو، قیس، فریاد، وغیرہ جیسی علامتوں اور تشبیہوں کی جگہ نئی علامتیں وضع کی گئیں۔ فطرت کے اجزاء کو غزل میں نئی علامتوں کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ ابر، کوہسار، شبنم، چاندنی، ہوا، پیڑ، شاخ، پرندے، بگولہ، آندھی، سراب، ریت، دریا، ساحل، پتے وغیرہ جدید غزل کا حصہ بنے۔ بہرحال، علامتوں کے استعمال میں بے اعتدالی اور انتہا پسندی کی وجہ سے غزل میں

ابہام پیدا ہوگیا اور شعر کو زیادہ سے زیادہ مبہم بنانے کو فن کی معراج سمجھا جانے لگا۔اور غزلیں ترسیل کی ناکامی کا شکار ہوگئیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد اردو میں کھلے پن کا دور آیا اور افسانوں اور شاعری میں قاری کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔علامتوں کے استعمال سے انکار نہیں کیا گیا صرف روایتی انداز بیان کے ساتھ ہی علامتوں کے متوازی استعمال کے رجحان کو قبولیت ملی۔افسانوں میں کہانی پن لوٹ آیا اور بیانیہ میں ہی افسانے لکھے جانے گئے۔اس دور کو ادب میں مابعد جدید دور کہا گیا۔مابعد جدیدیت ترقی پسندی یا جدیدیت کی طرح کوئی ادب و سیاسی نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک ادبی منظر نامہ ہے۔جب شعراء وادباء نے جدیدیت کے منفی رجحانات کو خیر باد کہہ کر صرف اس کے مثبت پہلوؤں کو اپنایا اور ترقی پسندی اور رومانیت کے بھی مثبت عناصر اور روّیوں کو بھی اپنا کر ایک نیا تخلیقی روّیہ اپنایا تو مابعد جدیدیت کا منظر نامہ تیار ہوا۔مابعد جدیدیت کی خصوصیات میں عالمی تہذیبی، وثقافتی عناصر کی کی نمائندگی اور مقامی مسائل اور موضوعات کو ترجیح دینا، علامتوں کو متوازن استعمال، زبان و بیان میں ترسیل وابلاغ کو اہمیت دینا اور فطرت کے پس منظر میں انسانی جذبات واحساسات کو بیان کرنا شامل ہیں۔

اس دور میں افسانوں میں کہانی پن اور علامتی انداز کا مناسب امتزاج ملتا ہے۔اس دور کے افسانوں میں شعریت سے پرہیز اور کھردرے اور فطری طرز اظہار کو اہمیت دی گئی۔ساجد رشید کا افسانہ ''ایک مردہ سر کی حکایت'' کو نمائندہ مابعد جدید افسانہ کہا جا سکتا ہے۔انیس رفیع کا افسانہ ''اب یہاں گدھ نہیں اترتے'' ،اظہار الاسلام کا افسانہ ''سوراخ''، محمود یٰسین کا افسانہ ''سائیکی'' وغیرہ مابعد جدید افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔
افسانہ ''اب یہاں گدھ نہیں اترتے'' کا ایک اقتباس نمونے کے طور پر پیش ہے۔

'' وہ ایک ویرانہ تھا۔اس ویرانے میں پاؤں کی دھمک، کدال کی چھینٹو، ہل کے پھالے، ہنسوے کی کھر کھر اس کی یاداشت کا حصہ نہ تھے۔بزرگوں سے استفار کرنا۔مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر چپ ہو جاتا۔پوری آبادی بعد کے اس طرف سمٹی ہوئی تھی۔معبد کے اس طرف ایکڑ کے جنگل تھے۔اس جنگل کو کبھی کسی نے کٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔نہ کسی کو جانور چراتے ہوئے دیکھا۔بچوں کو اس طرف جانے کی سخت ممانعت تھی۔''

مابعد جدید دور کی شاعری میں بھی اعتدال کے نقوش واضح ہوگئے تھے۔اس میں بھی ترسیل کو اہمیت دی جانے لگی۔غزلوں میں علامتوں کا استعمال توازن کے ساتھ ہونے لگا اور ابہام کو ایک عیب سمجھا جانے لگا۔کلاسیکی اور فارسی کی اصطلاحوں کی جگہ جدید ہندوستانی علامتیں اور پیکر تراشے گئے۔عام فہم الفاظ کو ترمیم دی جانے لگی۔فارسی کے بجائے ہندی کے الفاظ کو بوقت ضرورت استعمال کیا جانے لگا۔ہندو اساطیر کو اشعار میں جگہ ملنے لگی۔اس طرح غزلوں میں قارئین کی دلچسپی لوٹ آئی۔اس دور میں بنگال میں منور رانا، خالق عبداللہ، اشہر ہاشمی، فراغ روہوی، ف۔س۔اعجاز، اشرف یعقوبی، عنبر شمیم، احسن شفیق، رونق نعیم قابلِ ذکر ہیں۔انکی شاعری میں مابعد جدیدیت کے نقوش واضح ہیں۔

لفظ و معنی کی نمائش ہم نے سیکھی ہی نہیں
مختصر کہتے رہے ہم مختصر سمجھا کئے
(نصر غزالی)

ہے انتشار میں خود ساختہ امیر کی فوج
سنبھالے کون اب اس کا شان گرتا ہوا
(اشہر ہاشمی)

وہ تو لکھا کے لائی ہے قسمت میں جاگنا
ماں کیسے سو سکے گی کہ بیٹا سفر میں ہے
(منوّر رانا)

شہر میں ایک بھی بچہ نہیں رونے والا
دانے دانے کو ترستا ہے کھلونے والا
(شہود عالم آفاقی)

مابعد جدید دور میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں کو بھی اہمیت دی گئی اور پابند نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظم، معرا نظم اور نثری نظم کو بھی شاعروں نے اظہار کا وسیلہ بنایا مگر غزل اب بھی بیشتر شاعروں کی محبوب رہی۔ غزل میں ارضیت کا اضافہ ہونے سے اور مقامی رنگ گہرا ہونے سے غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

اکیسویں صدی میں جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کو ترقی ہوئی اور ترسیل وابلاغ کے شعبے میں کافی پیش رفت ہوئی تو زبان اور رابطے کے طریقے اور وسائل بھی نئے وجود میں آئے ہیں۔ انٹرنیٹ، فیس بک، ٹوئٹر اور واٹس ایپ کے استعمال نے ادب اور زبان کے سانچوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ اس لئے اس کا اثر ادب اور خصوصاً شاعری پر پڑا ہے۔ لہٰذا، اکیسویں صدی کی شاعری بیسویں صدی کے مابعد جدید دور سے قدرے مختلف ہے۔ مگر ابھی اس کی خصوصیت واضح نہیں ہوئی ہیں اور اس شاعری کے مطالعے کے پیمانے اور اصول متعین نہیں ہوئے ہیں۔ اس دور کو اردو میں ابھی کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس دور کے افسانوں کو نیا افسانہ اور شاعری کو نئی شاعری کہکر ہی کام چلایا جارہا ہے۔ امید ہے اس دور کے ادب کے خد و خال اگلے چند برسوں میں اور واضح ہونگے اور اس کی سمت ورفتار متعین کی جاسکے گی۔

اکیسویں صدی میں بنگال میں سرگرم افسانہ نگاروں میں انیس رفیع، صدیق عالم، نذیر احمد یوسفی، عشرت بیتاب، اظہار الاسلام، محمود یٰسین، مشتاق انجم، خان شین کنور، شکیل افروز، ارشد نیاز، سلیم سرفراز، کہکشاں پروین، شہیرہ مسرور، یاسمین اختر، مسرور تمنا، شاہین سلطانہ، ترنم جمال، وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس دور میں جو لوگ شاعری میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ان میں عاصمؔ شہنواز شبلی، فراغ روہوی، ضمیؔر یوسف، نسیم عزیزی، شہناز نبی، نغمہ نور، تسلیم نیازی، شمیمؔ انجم وارثی معراج احمد معراجؔ، ظفر عالم ظفؔر، نوشاد مومن، ندیمؔ احمد، اکبر حسین اکبؔر، وقیع منظر، سہیلؔ ارشد، مسلم نوازؔ، صدیق عالم، عالؔم انجم وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں بنگال میں غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی فروغ ہوا ہے اور بہت سے شعراء نے نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ مجموعی طور پر بنگال میں اردو ادب نے مختلف ادبی تحریکات اور نظریات کا اثر قبول کیا اور اپنے دامن کو فنی پیکروں اور فکروں کی لعل وگہر سے بھر لیا ہے۔

☆☆☆

سب رس
میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور
تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

مضمون

محبوب خان اصغر

نسائی ادب کی توانا آواز۔فہمیدہ ریاض

تقسیم ہند ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس کے بعد حیدرآباد اور اس کے زوال سے ہمارے ذہنوں پر جو اثرات مرتسم ہوئے تھے ان کی چبھن میں بھی کمی نہ آسکی۔ان واقعات کے بعد ملک سے کئی ایک اہم عبقری شخصیتیں پاکستان ہجرت کر گئیں جن میں ڈاکٹر'انجینئر' سائنسداں 'ادیب 'شاعر' ماہرین تعلیم اور ماہرین طبقات الارض شامل ہیں۔ان میں اکثر پیوند خاک ہوگئے اور دوسری نسل اپنی عمر کے کناروں پر پہنچ چکی ہے۔وقتاً فوقتاً ان کے بھی فوت ہوجانے کی خبریں ملتی رہتی ہیں ۔افسوس ان کی موت کا نہیں کہ موت برحق ہے بلکہ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ جین حیات وہ ہم سے اور ہم ان سے دور رہے۔ان ہی میں سے ایک فہمیدہ ریاض ہے۔یوں بھی پچھلے تین مہینوں نے ہمیں تین زبردست زخم دیئے ہیں۔تین بڑے فنکاروں کی موت کا غم کاری زخم سے کم تو نہیں ہے ۔قاضی عبدالستار' مضطر مجاز اور اب فہمیدہ ریاض۔تمام ادب دوست ان تینوں کو عزیز رکھتے تھے اور اپنی تحریروں کے حوالوں سے قارئین سے ان کا رشتہ بہت ہی مضبوط تھا اور تینوں ہی اپنی ذات میں منفرد اور اپنے اپنے میدان میں اکائی تھے لیکن اس وقت ہمیں کچھ باتیں فہمیدہ ریاض سے متعلق کرنی ہیں جنہیں مسلسل ریاض سے شعر وسخن کی فہمیدگی حاصل ہوئی تھی۔ پاکستان میں رہ کر تمام ادبی علاقوں میں اپنی فکر کی توانائی کے سبب اپنا سکہ جمایا اور آخری سانس تک قرطاس وقلم سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔انسانی اقدار کی بازیافت ان کی شاعری کا اہم حوالہ تھا۔آج جبکہ شاعری کی صحت مند روایات پامال ہورہی ہے ۔مشاعرے نوٹنکی بن گئے ہیں جہاں ذہنی اور اخلاقی معیار تو دور بگاڑ کا مکمل سامان مہیا کیا جارہا ہے ایسے میں اچھے شاعروں کا منظر سے ندارد ہوجانا تکلیف دیتا ہے چنانچہ فہمیدہ ریاض کی رحلت کی خبر سن کر ملالت سا ہوا۔

فہمیدہ ریاض 28 جولائی 1946ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئی تھیں۔تعلیم سندھ میں ہوئی جہاں ان کے والدین مقیم تھے۔ جب ان کے والد ریاض الدین کا انتقال ہوا فہمیدہ صرف پانچ برس کی تھیں۔ ماں نے اپنی تمام ہی اولادوں کی بہترین انداز میں پرورش کی اور انہیں اعلیٰ تعلیمی مدارج تک پہنچایا۔ 1967ء میں فہمیدہ پابہ رکاب برطانیہ ہوئیں ۔بی بی سی ریڈیو سرویس میں کارگذار رہیں۔ 1972ء میں یہ سلسلہ ترک ہوگیا۔ ایک سال لندن اسکول آف ٹکنیک میں فلم ٹکنیک کا کورس کیا اور 1973ء میں سندھ آگئیں۔ایک رسالہ آواز کے نام سے نکالا۔جنرل ضیاء الحق کے عہد میں فہمیدہ پر بڑے بڑے مقدمات دائر کئے گئے بلکہ ضیاء الحق کے ساتھ فہمیدہ کا معرکہ تو ایک مثالی داستان بن گیا۔کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں فہمیدہ پر جو مقدمے دائر کئے گئے تھے اس میں ایک مقدمہ کی سزا پھانسی یا عمر قید بھی تھی۔اس وقت فہمیدہ نے سیاسی پناہ لے کر 1981ء تا 1987ء ہندوستان میں رہیں۔ اُس دور میں فہمیدہ نے جو نظمیں لکھیں وہ ایک جبر کے دور کی طاقتور اور دلخراش گواہی بن گئیں۔ان کی نظمیں ''خانہ تلاشی'' ''کوتوال بیٹھا ہے'' اور طویل نظم ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھوگے''۔ایک عورت کے اُس دور سے گذرنے اور کرب کو جھیلنے کی وہ داستان سناتے ہیں جو کسی رزمیہ کی مانند ہیں۔آصف فرخی نے فہمیدہ کی نظموں کے اسلوب کو کلاسیکی نفاست کا نام دیا ہے اور یہ نفاست ان کی پوری

شاعری کو محیط ہے۔اس کے علاوہ ان کی لفظیات اور ان کی معنویت نے انہیں پاکستانی شاعرات میں بہت نمایاں حیثیت دی ہے۔ان کی نظموں کا موضوع نسائی نفسیات زیادہ رہا۔ خواتین کے احساسات، خیالات اور جذبات کے ساتھ انہوں نے خواتین کی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔فہمیدہ ریاض جامعہ اسلامیہ میں پوئیٹ ان ریسڈینس تھیں۔ پھر سینئر ریسرچ فیلو بھی رہیں۔آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف سوشیل ریسرچ اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل ریسرچ شعبہ میں بھی کام کیا۔ پاکستان واپس آئیں اور اسلام آباد میں مقیم ہوئیں۔نیشنل بک آف کونسل پاکستان میں چیئر پرسن رہیں۔منسٹری آف کلچرل کی کنسلٹنٹ رہیں۔ 1997ء میں ایک این جی او (WADA) ویمن اینڈ ڈیولپمنٹ اسوسی ایشن کے نام سے رجسٹرڈ کروایا تھا۔ وہ ایک پبلیشنگ ہاؤز بنانے کی خواہش مند تھیں جہاں سے بچوں اور عورتوں کے لیے کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی جاسکے۔

احمد ندیم قاسمی نے فہمیدہ کی شاعری کو اپنے رسالہ فنون میں متواتر جگہ دی۔ قاسمی مردم شناس ہونے کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔انہوں نے فہمیدہ میں عظمت کے آثار شناخت کر لئے تھے۔ان کے اس برتاؤ سے فہمیدہ کو بہت فائدہ ہوا۔ اور اسی شفقت نے پروین شاکر کو بھی بلندیوں سے ہمکنار کیا تھا۔

فہمیدہ نے اپنی شاعری میں جہاں مشرقی عورت کی مجبوریوں کا بیباکانہ اظہار کیا ہے وہیں روایات سے آزاد اور خود مختار ہونے کی بھی خواہش کو ظاہر کیا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتیں جس میں عورت اور مرد کو برابری مل سکے۔ ان کے ہاں غزلوں کے مقابل نظمیں زیادہ ہیں بلکہ ان کے فکر و فن کے اصل جوہر نظموں ہی میں کھلتے ہیں۔ان کی ہمعصر پروین شاکر نے تخلیقی اظہار کے لیے صنف غزل کو اپنایا تھا لیکن فہمیدہ نے پتہ نہیں کیوں غزلیں نہیں کہیں۔مختلف کیفیات سے جب بھی دوچار ہوتیں یا اظہار کی تڑپ پیدا ہوتیں یا خلش کو ہڈیوں میں محسوس کرتیں تو خیال کو سینے پر بوجھ بنا کر نہیں رکھتی تھیں بلکہ اپنے قاری یا سامع سے شاعری کو ذریعہ گفتگو بنایا۔فہمیدہ کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''پتھر کی زبان'' 1967ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ''بدن دریدہ'' ''دھوپ'' ''قافلے پرندوں کے'' ''یہ خانہ آب و گل'' بعد کو ایک کلیات ''سب لعل و گہر'' کے نام سے شائع کیں۔انہوں نے جلال الدین رومیؒ کی فارسی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا اور 1998ء میں ایرانی نژاد شاہ فروغ فرخ زاد کے فارسی کلام کا ترجمہ بھی ان ہی کے قلم کا مرہون منت ہے جو'' کھلے دریچے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ سندھی شاعر شیخ ایاز کی سندھی شاعری کا اردو ترجمہ بھی فہمیدہ کا کمال ہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین (خواتین) کی وہ بانی رہیں اور ''المانتی'' ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی شاعرہ رہیں۔ انہوں نے ستارہ امتیاز اور صدارتی تمغہ برائے ادب حاصل کیا تھا۔

آج سے چند برس پہلے تک صرف اصلاحی مضامین کے توسط سے ہی اکثر خواتین ادبی سطح پر جانی جاتی تھیں۔خواتین کا منظر عام پر آنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔پس پردہ رہ کر ہی لکھنے کا رواج عام تھا۔جیلانی بانو، عفت موہانی، قمر جمالی، رفیعہ منظورالامین، نجمہ نکہت، سکینہ وسیم عباس، محمدی بیگم، رشید النساء اور نذر سجاد کے ناموں کی گونج سنائی دینے لگی تو کئی خواتین کو تحریک ملی اور وہ لکھنے کی طرف مائل ہوئیں۔عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور زاہدہ حنا نے نسائی ادب کو بام عروج پر پہنچادیا۔ان تخلیق کاروں نے نسائی ادب کے حوالے سے خواتین کو گویائی دی۔جس کے بعد بہت سی ایسی خواتین جو مستور تھیں ادب کی سطح پر نمودار ہوئیں اور مضامین، شاعری اور فکشن کے ذریعہ سے اپنے وجود کو منوایا۔ اپنی حسیت، اپنی ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنے

لگیں۔اس عمل سے کئی چراغ جلے اور ایک دنیا ان کی روشنی کی قائل ہوگئی۔ایسی روشنی جس میں درون ذات اور بیرون ذات نیز داخلی اورخارجی مسائل واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔یہ سلسلہ عرصہ دراز تک صرف نثری ادب تک ہی محدود رہا شعرگوئی کو بے فیض عمل بھی سمجھا جاتا تھا اور معیوب بھی لیکن شعری اظہار کی قوت بعض خواتین پر دیر تک قدغن لگا نہ سکی۔ بالآخر کانٹے دار راہوں پر بعض خواتین نے قدم رکھ ہی دیا۔ ان کی حوصلہ شکنی کی گئی ۔ روایت شکنی اور غیر مہذبانہ عمل کہہ کر ان پر پابندیاں عائد کی گئیں مگر جنہیں اپنے افکار اپنے جذبات اور اپنے احساسات کے اظہار کے لیے شعر کہنا تھا کہا اور خوب کہا۔ شفیق فاطمہ شیریٰ ادا جعفری' پروین شاکر' پروین فنا سید' صدیقہ شبنم' رفیعہ شبنم عابدی کے علاوہ اور بھی کئی ایسی شاعرات ہیں جنہوں نے میدان سخن کو اختیار کر کے اپنی کمیونٹی کے مسائل کو اپنی فکر کا محور بنایا اور اپنے عہد کے تجربات' مسائل اور حقوق کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا۔ان ہی میں فہمیدہ ریاض ایک روشن نام ہے جو نہایت بولڈ تھیں۔ دلیر اور بہادر تھیں۔جنہوں نے احتجاج کے لیے ایک معتبر راستہ اختیار کیا تھا جو کہ ان کا حق بھی تھا اور حق کا اظہار بہر حال حق ہے۔ وہ تدریس سے وابستہ رہیں۔ ساہیوال نامی سرکاری کالج میں لیکچرار تھیں۔اس مقدس پیشہ سے وابستگی کے سبب ان کے شعور کو جلا ملی۔اور ایک پختہ کار شاعرہ کے طور پر ان کے نام کا شہرہ ہر سو ہونے لگا۔شعری کائنات کو گلہائے رنگ سے مہکا کر انہوں نے خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ' وسیع مشاہدے' خوشگوار تجربے' عصری آگہی اور نئی حسیت کی حامل ثابت کیا۔ان کی نظموں میں جہاں اپنے عہد کے خدوخال جھلکتے ہیں وہیں اپنے عہد کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔فکر کی گہرائی کے ساتھ سماجی کشمکش اور ناسازگار حالات فہمیدہ کی نظموں کا وصف ہے اور یہ وصف اور یہ چمک اس وقت ہی نظر آتے ہیں جب کوئی فنکار مسائل کو دیکھتا بھی ہے اور ان سے دو چار بھی ہوتا ہے۔حالات سے آگاہی کے بعد حالات کو سدھارنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ان کی بعض نظموں میں تو نسوانیت (Feminism) کا شعور بہت نمایاں ہو کر آیا ہے۔ان کے یہاں اپنی اہمیت کا بڑا احساس تھا۔ اپنی سے مراد ''میں'' نہیں بلکہ ''ہم'' یعنی تمام خواتین کے حقوق کی بات کرتی ہیں۔طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ نظام کے نقائص کو بڑے سنبھلے ہوئے انداز سے پیش کیا ہے۔ زمانے نے تیر چلائے تو خود کو پیش کیا۔حالات سے مفاہمت نہیں کی۔ چاپ سادھ کر بیٹھ نہیں گئیں بلکہ مخالفت نے قلم سے ان کے رشتے کو مضبوط کیا۔ جارحانہ رویہ ماند نہیں پڑا۔ بلکہ ان کی نظمیں انقلابی آہنگ سے لیس ہونے لگیں۔ ان میں شدت اور تیزی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ایک واضح نقطہ نظر سے ان کی شاعری معمور ہوتی چلی گئی۔ وہ نقطہ نظر کیا تھا ؟۔خواتین کی آزادی' ان کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانا' ان کے اجتماعی پہلوؤں پر کھل کر بات کرنا۔مساوات کی قدروں کی بنیادی حیثیت کا اظہار اور اس کے لیے انہوں نے کبھی روایتی انداز اختیار کیا تو کبھی علامتوں اور تمثیلوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔ان کی بعض اعلیٰ درجے کی علامتی اور تمثیلی نظمیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔جس میں اسالیب کے تجربے کر کے اپنی شاعری میں وسعتیں پیدا کیں اور نظموں کو صیقل کیا۔فہمیدہ کا لہجہ بہت نکھرا ہوا تھا۔ان کی کئی نظمیں جدت طرازی کا خوبصورت مثال بن کر ان کی تصانیف میں پھیلی ہوئی ہیں۔

فہمیدہ کا خیال تھا کہ اپنے اظہار کے لیے غزل کو منتخب کیا جائے تو ردیف اور قافیہ کا چکر ستاتا رہے گا۔دوسری بات غزل کا چکر طویل نہیں ہوگا اس کے برخلاف نظمیہ شاعری ان کے من کو بھائی۔اور اسی کو اختیار کر کے جولان گاہ ادب میں شعلہ جوالہ کی مانند بلند ہوئیں۔ ان کی تمام تر صلاحیتیں منتہائے عروج پر تھیں

اورانہوں نے ادبی منظر نامہ کو خیرہ کر دیا۔ ان کے کلام کی سحر بار نغمگی اور حُسن کا اعتراوقت کے جید ناقدوں اور ہمالیائی فکر کے حامل لوگوں نے کیا ہے۔ وہ تین مختصر ناولوں کی بھی خالق رہیں۔ فہمیدہ ریاض سے متعلق شمشاد کاظمی لکھتے ہیں: ''خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی خاتون کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان میں فوجی آمریت اور غائب رہائش زمینداری کی مخالفت کیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ ''پتھر کی زبان' ملاؤں اور جاگیرداروں کو متعصب وطن پرست اور حکمراں کے لباس میں بے نقاب کرتا ہے۔ خواتین کی آزادی کی پرجوش حمایت کرنے پرانہوں نے چند برس ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی گذاری۔ (ہفتہ وار کوہسار۔ بھاگلپور'از: شمشاد کاظمی تہران' ص:2)۔

فہمیدہ کو سماج کے مروجہ اصول وضوابط سخت ناپسند تھے۔ اس بات سے ان کے اندر ایک اضطراب آمیز سکون پایا جاتا ہے۔ انہوں نے سماج میں نافذ قانون کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ مساوی حقوق کی تڑپ ان کے یہاں آخری سانس تک رہی۔ عورتوں کا استحصال انہیں سخت ناپسند تھا۔ جوں جوں حالات کا گہرا شعور انہیں حاصل ہوتا گیا' اپنے فن کے ذریعہ سماج کے اخلاقی قدروں کی پامالی پر تازیانے لگائے۔ ان کے اس عمل سے عمارت کہنہ ہل گئیں۔ ذہنی گھٹن اور پسماندہ ماحول میں انہوں نے خود کو کمزور نہیں جانا بلکہ خود کا استعمال اپنی یعنی پوری خواتین کی عظمت اور اہمیت کو منوانے کے لیے کیا۔ ان کی جرت اظہار کو فحش گوئی گردان کر ان پر مقدمات بھی دائر کیے گئے لیکن فہمیدہ نے ان کی پرواہ نہیں کی کیوں کہ ان کے اندر یہ احساس جاگزیر ہو گیا تھا کہ وہ ایک عورت کے ساتھ معاشرے کی ذمہ دار خاتون بھی ہے۔ شاعرانہ بیبا کی اور جذبات کی بے حجانی کا جو انداز انہوں نے اختیار کیا تھا سخت مخالفت کے باوجود اُس سے مبرا نہیں ہوئیں بلکہ اس طرز عمل کے سبب وہ صف اوّل کی شاعرہ قرار پائیں۔

انسان کو بالخصوص خواتین کو زندہ رہنے کا حوصلہ دینے والی شاعرہ فہمیدہ ریاض ایک طویل تخلیقی سفر طئے کرنے کے بعد بالآخر 22 نومبر جمعرات کے روز ابدی نیند سو گئیں۔ پاکستان (کراچی) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ میں بہ مشکل پچاس نفوس تھے۔ ان ہی کے ایک شعر پر گفتگو سمیٹتے ہیں۔

کس سے اب آرزوئے وصل کریں
اس خرابے میں کوئی مرد کہاں

☆☆☆

''میں ان نظموں کو پڑھتا چلا گیا اور ان کے سحر میں کھو گیا۔ پروین شیر اتنی اچھی اور کھری شاعر نکلیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ تخلیقیت اور دل سوزی میں ڈوبی ہوئی ایسی پُر اثر آواز.....نظموں میں یورپی اور فرانسیسی اثرات نے کچھ جادو سا گھول دیا ہے۔ میں سکتے میں رہ گیا''۔

گوپی چند نارنگ

شاعرہ، مصورہ، ادیبہ پروین شیر
کی چوتھی کتاب

بے کرانیاں

ادارہ نیاب ادب، بنگلور

شاعری

غزلیں

مصطفیٰ شہاب

سوال ہوتا، صعوبتوں میں رفاقتوں کا
حساب دیتے سب اپنی اپنی محبتوں کا

جہاں بھی جاؤں بیاں کروں گا ہزار قصے
کہ ساتھ جائے گا میرا بستہ حکایتوں کا

پہنچ رہی ہیں سبھی دعائیں اسی کے در پر
جسے پتا ہے نوائے دل کی حقیقتوں کا

بکھر رہے ہیں تمام رشتے نئی ہوا میں
نہیں رہا چاہتوں میں کھٹکا روایتوں کا

کئی امیدوں سے منسلک تھی ہماری یاری
اگرچہ دفتر کھلا ہوا تھا شکایتوں کا

تمھاری میری خموشیاں محوِ گفتگو ہیں
گیا زمانہ وہ رنجشوں میں وضاحتوں کا

تھکا کے دم بھر کے اس سفر میں سنایا اس نے
شہاب آگے بھی سلسلہ ہے مسافتوں کا

شاعری

غزل/نظم

عابد علی عابد

بیکار جانا نالۂ آفاق گیر کا
بہنا کسی کے ہجر میں آنکھوں سے نیر کا
جانا تلاش یار میں دشت وجبل کی سمت
سمجھانا با رہا مجھے میرے ضمیر کا
رہنا یہاں بشر کا سدا مشکلات میں
ہونا ضروریات کے جم غفیر کا
آرام کرنا سایۂ دیوار کے تلے
یہ کام بھی ہے ریختہ تمثال میر کا
سازش میں حاکموں کی شہنشاہ کے خلاف
ہونا بطور خاص ملوث وزیر کا
دیرینہ التجا مری یارب قبول کر
ماحول خو شگوار کر بر صغیر کا
منہ سے نکلنا بات کا اچھی بری سہی
تحویل سے کماں کی نکلنا ہے تیر کا
لینا بیان فرد کا پیشی سے پیشتر
کرنا سوال قبر میں منکر نکیر کا
عابدؔ متاع وقت نہ لانا بروے کار
آنا اخیر عمر دم نا گزیر کا

میانمار کے مہاجروں کے نام

یہ مہاجر کس قدر مجبور ہیں
زندہ رہکر زندگی سے دور ہیں
ان پہ ٹوٹا ہے مصیبت کا پہاڑ
بستیاں انکی ہوئیں ویران اجاڑ
رکھ کے دہشت گرد بیچاروں کا نام
فوج نے جینا کیا ان کا حرام
بچہ ہے بوڑھا ہے عورت مرد ہے
جو مسلماں ہے وہ دہشت گرد ہے
ماننے والے یہ گوتم بدھ کے ہیں
دھرم کی رو سے مخالف یدھ کے ہیں
اہل برما دیکھنے میں سادہ ہیں
بربریت پر مگر آمادہ ہیں
ہم کو یہ کہتے ہوئے آتی ہے لاج
بٹگیا قوم و مذ اہب میں سماج
کفر و دیں اک ساتھ رہ سکتے نہیں
برملا لیکن یہ کہہ سکتے نہیں
دہر میں ہر جا بپا ہے کربلا
قتل انساں شیوۂ دنیا ہوا
زندہ ہوتا بعد ازاں اسلام ہے
کربلاؤں کا یہی پیغام ہے
باعث تکلیف ہوتا ہے سہی
کار ہجرت ہے نبیؐ کی پیر وی

شاعری

نظم وغزل

مسعود جعفری

(مضطر مجاز کے انتقال پر)

دستک بھی دے رہی تھی اسے موت بھی نہیں
کہتے ہیں وہ گزر گیا وہ چل دیا کہیں
فکر و خیال اس کے تھے سب آسماں نشیں
روتے رہیں گے حشر تلک سارے اب مکیں
اقبال کا مرید تھا امجد کا جانشیں
رحلت سے اس کی ہو گئے دونوں حزیں حزیں

اب ترجمان شاعر مشرق نہیں رہا
وہ شاعر حکیم وہ حاذق نہیں رہا
کیسے کہیں کہ شاعر صادق نہیں رہا
اب غالب عظیم کا عاشق نہیں رہا
اس کی ہر ایک بات میں معنی کے تھے گہر
وہ بحر بے کنار تھا ہر لفظ تھا قمر

مضطر تمہاری یاد میں روتے رہیں گے ہم
چہرہ بھی اشک سے دھوتے رہیں گے ہم
تم کو ہر ایک بزم میں کھوتے رہیں گے ہم
پلکیں ہماری یوں ہی بھگوتے رہیں گے ہم
تم بھی ابد کی خاک میں جا کر ہی سو گئے
اقبال کے رفیق مدد گار ہو گئے

میں پیرہن بھی چاک مرا کر نہیں سکا
آتی رہی ہے موت مگر مر نہیں سکا
تاریکیوں میں سانس لیا ڈر نہیں سکا
ملک عدم میں پاؤں مرا دھر نہیں سکا
مضطر مجاز مر گئے میں چپ کھڑا رہا
میں وقت کی صلیب پہ یوں ہی جڑا رہا

اندھیر راکھ ہو اک دیا جلانے تک
میں ٹوٹ ٹوٹ گیا صبح نو کے آنے تک
نہ کوئی فلسفہ ان کا نہ کوئی وہم و گماں
پتنگے خاک ہوئے شمع آزمانے تک
ہر ایک سمت ہی گلیوں میں خون بہتا ہے
مری تو موت ہے اب دس روپے کمانے تک
میں اپنے آپ کو نیلام کر سکا نہ کبھی
بہت سی بولیاں لگتی رہیں زمانے تک
مرا ہمالہ مرے ساتھ کر سکا نہ وفا
جلا ہے ہاتھ مرا برف کے ہٹانے تک
وہ مرے ساتھ رہا تھا کئی برس لیکن
بڑی ہی دیر لگی ہے اسے بھلانے تک
اصول توڑ دیئے ضابطے بھلا بھی دیئے
تہس نہس بھی ہوی زندگی کمانے تک
نکل کے آگیا باہر حسین سا پیکر
مزہ بھی آگیا زنجیر کے ہلانے تک
ذرا بتا تو سہی جعفری ہوا کیا ہے
بڑی ہی دھوم مچی ہے شراب خانے تک

شاعری

غزلیں

بی ایس جین جوہر

آندھیوں کی یورش سے ہم نے دل لگی کی ہے
پیار کے چراغوں سے گھر میں روشنی کی ہے
جب سے غم کے ماروں سے ہم نے دوستی کی ہے
شہر کے امیروں سے مول دشمنی لی ہے
قاتلوں سے کیا ڈرنا قتل تو بہانا ہے
جان تو وہی لے گا جان جس نے بھی دی ہے
پیار سے دُلارا ہے، غم کے آنسو پونچھے ہیں
کوئی ہم سے بتلائے کیا زیادتی کی ہے
کیوں زمین ہڑپنے کو اپنا سر کھپاتے ہو
محل سب تمہارے ہیں، جھونپڑی اک اس کی ہے
کرتے ہو کسانوں کو خودکشی پہ آمادہ
اور پھر یہ کہتے ہو ہم نے اُنّتی جو کی ہے
چھین کر زمینوں کو کارخانے لگوائے
کھیتیاں اُجاڑی ہیں میں کمی کی ہے
کھانے کو ہزاروں منہ روز بڑھتے جاتے ہیں
پانی اور غلّے کی کیا فراہمی کی ہے
ایک دن وہ آئے گا روز مرتے دیکھو گے
بھک مروں کو ٹی وی پر اٹ پٹی سی ہے

سیما شکور

کتنی سادہ ہیں یہ پاگل آنکھیں
ہر راز بتا دیتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
تمھاری بات کوئی سمجھے ضروری تو نہیں
کیوں دل اپنا دکھاتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
یہ زندگی ہے یا کسی دریا کا سکوت
سمندر کا سمندر بہا دیتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
جو اپنا لگے وہ اپنا بھی ہوا ایسا تو نہیں
اتنا بھی نہیں سمجھ پاتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
جس راہ پر کانٹے ملے جس موڑ پر پتھر
وہیں جانے کی ضد کرتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہیں تمام رات
سونے بھی نہیں دیتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
زندگی بھر ترستے رہے زندگی کے لیے
زندگی تجھے ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ پاگل آنکھیں
درد ہو کسی کا چھلک اُٹھتی ہیں
سیماؔ جینے بھی نہیں دیتی ہیں یہ پاگل آنکھیں

شاعری

غزلیں

بدر محمدی

مری زمین ترے آسماں سے بہتر ہے
یقیں یقیں ہے کسی بھی گماں سے بہتر ہے

کہاں نہیں ہے تو جلوہ نما خدا میرے
ہی لا مکانی تری ہر مکان سے بہتر ہے

میں اس کے ساتھ دلوں کے سفر پہ رہتا ہوں
خیال اس کا کسی کارواں سے بہتر ہے

ذرا سا وقت ہے اس کا ر ہے خیال تمہیں
وہیں سے قصہ سناؤ جہاں سے بہتر ہے

گزاری عمر ہی اب تک نہ آیا جینا ہمیں
ہماری زندگی جانے کہاں سے بہتر ہے

دعائیں دینا کسی کو شعار خوب سہی
دعائیں لینا مگر اپنی ماں سے بہتر ہے

سکھائے وہ اسے جنت ہے جس کے قدموں میں (۴)
زبان مادری ہر اک زباں سے بہتر ہے

بیچ منجدھار میں ہے وقت کا مارا کوئی
ڈھونڈتا ہے کسی تنکے کا سہارا کوئی

اوڑھ کر جسم پہ تنہائی برہنہ ہوں میں
آکے پہنا دے مجھے تن کا اتارا کوئی

بے خبر دیکھ جدا ہو کے کسی پل خود سے
کیسے کرتا ہے ترے بن بھی گزارا کوئی

دور ساحل سے رہوں ہے یہ کسی کی کوشش
اس لائے مجھ سے کیے جائے کنارا کوئی

زندہ رہنے سے ہوا جاتا ہوں میں بے پروا
جان سے بھی ہے زیادہ مجھے پیارا کوئی

ٹمٹمانا ہی سہی بام فلک پر ہے وہ
میری قسمت کا نہیں اور ستارا کوئی

بدرؔ بہتے ہوئے دریا کا ہیں ٹھہرا پانی
دورے جائے بہا کر مجھے دھارا کوئی

غزلیں

نبیل احمد نبیل

شاعری

حوصلہ ہے یہ بھی دل کا اور ہُنر آنکھوں کا ہے
اُن کی جانب مدّتوں سے اِک سفر آنکھوں کا ہے
اتنی شدّت سے ستاروں کی طرف دیکھا نہ کر
مجھ سے لوگوں نے کہا اِس میں ضرر آنکھوں کا ہے
حُسن ہے جلوہ نما بامِ طلب پہ آج کل
یہ نگاہوں کا اثر ہے یہ ثمر آنکھوں کا ہے
مفت میں بدنام ٹھہرا ہے دلِ سادہ مرا
جس قدر بھی جُرم ہے سارا مگر آنکھوں کا ہے
ایک پل اُس کو نظر سے اُس طرف ہونے نہ دیں
خوف یہ دل کا نہیں ہے سر بہ سر آنکھوں کا ہے
کب کسی زخمِ تمنّا کو میّسر دل رہا
کب میّسر اشکِ غم کو کوئی گھر آنکھوں کا ہے
اپنی بینائی سے مشعل کو جلانا رات بھر
ایک مدّت سے یہی کارِ سحر آنکھوں کا ہے
لمحہ لمحہ رات کا جو ہو رہا ہے ضوفشاں
نور کا یہ سلسلہ اے بے خبر، آنکھوں کا ہے
حسرتوں کو بارہا گنتا ہوں میں گرچہ نبیل
میرے سینے میں نہاں اِک ایسا ڈر آنکھوں کا ہے

ہم سے پتھر مزاج لیتا ہے
زندگی کا خراج لیتا ہے
بیچ کر باپ ہر نَفَس اپنا
اپنی بیٹی کا داج لیتا ہے
اِس کی فطرت میں تیرگی ہے فقط
روشنی کب سماج لیتا ہے
دل بھی کیا چیز ہے ستم گر سے
عشق کا کام کاج لیتا ہے
کون ہے جو مری صداؤں سے
نعرۂ احتجاج لیتا ہے
اُلٹی رکھتا ہے وقت کی ترتیب
میرا کل، میرا آج لیتا ہے
جس کی فطرت میں خاکساری ہو
وہ کہاں تخت و تاج لیتا ہے
میں اُگاتا ہوں خون سے فصلیں
اور وہ سب اناج لیتا ہے
سب مسیحا ہیں اپنی دُھن میں نبیل
کون زیرِ علاج لیتا ہوں

شاعری

نظمیں

رفیق جعفر

ڈور

اپنے جیون میں تم
جس ڈور کو
تھامے ہوئے ہو
تھامے رہو تو ہی
بہتر ہے
دوسری ڈور کو
پکڑنے کی کوشش میں
کہیں پہلی ڈور بھی
چھوٹ نہ جائے

ہم قدم

ہم قدم کو
غنیمت جانو
کہ وہ تمھارے
ساتھ تو ہے
پر اک بات یاد رہے
کہ چلتے وقت
فاصلہ رکھنا
اور اس کے
پیروں کی
ہر حرکت پر
کڑی نظر رکھنا

خوشبو سے روح کا رشتہ

طرح طرح کے
تازہ پھولوں کی
خوشبو سے
روح مہکتی
اور جسم کو
تروتازہ رکھتی ہے
لیکن اب ہم
دیکھ رہے ہیں
اس صدی میں
نقلی پھولوں کا چلن
جیسے جیسے عام
ہو رہا ہے
ویسے ویسے
خوشبو سے روح کا رشتہ
ٹوٹ رہا ہے
آج کل کی
نئی نئی بیماریوں میں
یہ بھی شاید
اک طرح کی
بیماری ہے
مہلک بیماری

شاعری

غزلیں

محبوب خان اصغر

شکستِ ذات کا عرفان کرنے والا ہوں
میں اپنے آپ پر احسان کرنے والا ہوں

رفیق ہو کہ رقیب اس میں سب سماجائیں
میں ایسی وسعتِ دامان کرنے والا ہوں

اندھیری رات میں کالے ورق پہ کچھ لکھ کر
میں اپنے یاروں کو حیران کرنے والا ہوں

جدھر بھی دیکھیے تازہ لہو کی بوندیں ہیں
تو نذر اپنی بھی میں جان کرنے والا ہوں

اُسے شکست ہے میری عزیز تو سن لے
''میں اپنی ہار کا اعلان کرنے والا ہوں''

اُسے تو زعمِ خدائی کیسے بتلاؤں
خود اپنی جان کا میں دان کرنے والا ہوں

کچل کے اپنی انا اصغؔر اپنے پاؤں تلے
خود اپنی ذات کو میزان کرنے والا ہوں

لئے لئے پھروں کب تک انا کا چکر میں
کبھی تو پاٹوں گا اک روز یہ سمندر میں

اُسی کو سوچتا رہتا ہوں میں خیالوں میں
وہ آئے سامنے تو دیکھ لوں نظر بھر میں

زمین کائی بھری ہے جدھر نظر ڈالوں
چلوں تو کیسے چلوں اب سنبھل سنبھل کر میں

کہاں میں اور کہاں میر و غالب و ناصر
غزل سرا ہوں، بنوں ایسا بھی سخنور میں

زمین پہ دیکھ لیا آسمان پہ دیکھ لیا
تجھے تلاش کروں گا اب اپنے اندر میں

میں ایک مشتِ کفِ خاک ہی رہا اصغؔر
کہ مسخ چہروں کو دیکھا ہوا مکدّر میں

شاعری

نظمیں

مصداق اعظمی

مجبوری

ایک بیوہ نے
بے چارگی چھوڑ کر
اپنے بچوں کی
آنکھوں کو نم دیکھ کر
آج بے جان ہونٹوں میں
رس بھر لیے

تلاش

تیری باتوں میں سنسناہٹ ہے
تیرے ہونٹوں پہ
کپکپی سی ہے
تری آنکھوں میں
میکدے آباد
تیری زلفوں میں رات ٹھہری ہے
تیرے لہجے میں
ایک مدھم سا
سازِ پوشیدہ
بجتا رہتا ہے
تیری پیشانی چاند جیسی ہے
تیرے گالوں میں ہیں گلاب چھپے
اور مرا دل بھی چاہتا ہے یہ
ساری دنیا سے بے خبر ہو کر
تجھ میں خود کو بھی تلاش کروں

پانی

ہر سانس کی عنوانِ کہانی کے لیے جنگ
اک روز لڑی جائے گی پانی کے لیے جنگ
پانی نہیں ہوگا تو بھلا کون رہے گا
اس زیرِ فلک تو ہی بتا کون رہے گا
پانی نہیں ہوگا تو بھرم کون رکھے گا
جلتی ہوئی دھرتی پہ قدم کون رکھے گا
پانی کی ضرورت ہمیں حیران کرے گی
دھرتی کے ہرے پن کو بھی ویران کرے گی
پانی کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے
کیا اپنی ضرورت ہمیں معلوم نہیں ہے
آئیں گی جو نسلیں وہ ہمیں یاد کریں گی
پانی کے نہ ہونے کے سبب سے جو مریں گی
یہ عہد نبھانا ہی پڑے گا ہمیں مل کر
پانی کو بچانا ہی پڑے گا ہمیں مل کر
ہم اپنی کہانی کو یوں ضائع نہ کریں گے

(۲)

شاعری

بے سود ہی پانی کو یوں ضائع نہ کریں گے
یہ سوچ کے پانی کو بچانا ہے ضروری
پانی نہیں ہوگا تو بچے گی نہ یہ دھرتی
اب کوئی دعا بھی ہمیں پانی نہیں دے گی
شنکر کی جٹا بھی ہمیں پانی نہیں دے گی

دختر ہند

وہ اک لڑکی
جسے میں نظم
کرنے آج بیٹھا ہوں
کبھی سیتا، کبھی مریم کی زہراؓ
کے چہرے میں
وہ اپنا روپ اکثر ڈھونڈنے لگتی ہے
خوش ہو کر
وہ اشنا کروالی فکر سے بھی
خوب واقف ہے
اسے سقراط و افلاطوں
کے بھی ہیں فلسفے از بر
اسے شیو جی کا درشن
خواب میں حیران کرتا ہے
گرونانک کی بانی میں
وہ سب سے بات کرتی ہے
کیلنڈر میں چھپے حسیں بھی
اس سے بات کرتے ہیں
وہ ملن پر جینے پرنے کا
جنوں بھی اس پہ طاری ہے
یہی ہے اس کی خواہش کہ
ترنگا ہو کفن اس کا
اذانوں کی صدا رس گھولتی ہے
اس کے کانوں میں
وہ اپنے آپ سے اللہ کا بھی
ذکر کرتی ہے
میں اس کو نظم کرتے وقت
یہ محسوس کرتا ہوں
کہ اس کو ہند کی مٹی سے
شاید میرے مولا نے
محبت نام کے مذہب
کی خاطر ہی بنایا ہے

سعیدہ بانو احمد

ڈگر سے ہٹ کر

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ روٹرم روڈ پر کپورتھلہ ہاؤس کا نیلام ہوا۔ میری بہن کو معلوم ہوا وہ بولی لگا آئیں اسی ہزار کی اور اسی قیمت پر نیلام ختم ہو گیا۔ وہ بیعانہ کے طور پر بیس ہزار دیکر گھر آئیں۔ میری والدہ کو اپنی خریداری کی روداد سنائی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سر دست بیس ہزار روپے دے سکتی ہیں پھر چھوٹے بھائی جان سے ذکر کیا وہ اپنی والدہ بیگم رضا کے پاس آئے اور ان سے چالیس ہزار بطور قرض میری بہن کو ولوا دیئے۔ کپورتھلہ ہاؤس کے چاروں طرف دس بیگھہ زمین کا باغ تھا۔ اب یہ طے پایا کہ کپورتھلہ ہاؤس اور چار بیگھ زمین میری بہن کا حصہ ہوگی اور باقی کے چھ بیگھے میں سے ایک بیگھے کے چھ پلاٹ بنا کر وہ دو پلاٹ بیگم رضا کو دے دیں گی ان کی اصل قیمت پر۔ بیگم رضا کی بڑی تمنا تھی کہ ان کا اپنا گھر ہو۔ انہیں ساری تجویز بے حد پسند آئی اور وسط ۱۹۳۵ء میں یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ زمین تو مل گئی ہے اب مکان کون بنوائے۔ بڑے بھائی جان غالباً بنارس میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ ہاشم کی تقرری احمد نگر میں ہوگئی تھی۔ مسعود رضا Imperial Finance کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ عباس رضا یعنی میرے شوہر لکھنو میں ہی سول جج تھے۔ ان ہی پر سب کی نظر گئی لیکن انہیں بھی فرصت کہاں تھی۔ سارے دن کورٹ میں گزار کر شام کو چند گھنٹوں کی نگرانی ایک مکان تعمیر کروانے کے لی تو کافی نہیں تھی۔ لیکن میں موجود تھی مجھے ایسے کاموں سے بہت دلچسپی تھی اور سب کو اس کا اندازہ بھی تھا کہ کسی کام کا بیڑہ اٹھاتی تو دل و جان سے اس میں لگ جاتی۔ میری ساس نے پورے بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بس ''سعیدہ دولہن مورا گھر بنوائے دیں گی''۔ میرا دل بھی بڑھا اور اپنے اوپر اعتماد بھی۔ کاغذ سے گھر کے نقشے بنانا شروع کیے۔ گھر ایسا ہوا کہ جس میں بیگم رضا کے طریقہ رہائش کا سب سے اچھا اور آرام دہ انتظام ہو۔ شہر کے مشہور Architect حامد حسین صاحب مانے جاتے تھے۔ ہم لوگوں سے ان کے سارے خاندان کا بہت ملنا جلنا تھا۔ حامد صاحب سے میں ملی۔ ان سے مکان کے بارے میں اپنی ضروریات بتائیں۔ اپنے ادھ کچے نقشے بتائے۔ انہوں نے ہماری ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر اور نقشے بنائے۔ سارے خاندان نے انہیں دیکھا اور متفقہ طور پر ایک نقشہ پسند کر لیا۔

ایک بنگالی ٹھیکیدار مترا بابو کو مکان تعمیر کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ بنیادی پتھر رکھنے کی رسم بڑے بھائی جان نے کی۔ کام زور و شور سے شروع ہوگیا۔ پھر ایک دن سننے میں آیا کہ Australia کے ایک Architect مسٹر Griffith لکھنو آئے ہوئے ہیں۔ میں دوڑی ہوئی ان کے پاس پہنچی۔ انہیں ساتھ لے کر Site پر آئی۔ Mr. Griffith نے کام دیکھا پھر کہا کہ بنیاد کھود دی جا چکی ہے۔ میں نقشے میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا۔ گھر کا سامنا کیا ہو اس کا نقشہ تیار کروں گا۔ چنانچہ مکان کا Facade، Mr.Griffith کی تخلیق رہی۔ ۱۹۳۸ء کے شروع میں مکان تیار ہو گیا۔ باہر سے دیکھنے میں بہت غیر معمولی اور خوب صورت معلوم ہوتا تھا اور اندر سے سب کے آرام کا خیال رکھا گیا تھا۔ یہ گھر Clyde روڈ پر سکندر باغ کے پھاٹک کے بالکل سامنے تھا اور ہمارے ڈاکٹر، ڈاکٹر لہری اسے Garden House کہا کرتے تھے۔ مکان کا نام بھی میرا تجویز کیا ہوا پسند کیا گیا اور پھاٹک پر ''کاشانہ رضا'' نام کا بورڈ لگا دیا گیا۔

میں اس مکان کی تعمیر کا آدھا کام سیتا پور سے آکر کرواتی رہی۔

سیتا پور کے گھر کی تفصیل میں پہلے لکھ چکی ہوں۔ زندگی بھی ایک ڈھرے پر آگئی۔ عباس رضا صبح کچہری چلے جاتے۔ شام کو واپس آتے تو ناشتے میں مٹر پھلکیاں نمک پارے، سینڈوچ، کبھی پوری کباب اس طرح کی چیزیں ہوتیں۔ اس زمانے میں شام کی چائے کا بہت اہتمام ہوتا تھا کیوں کہ صبح ناشتہ کر کے کچہری جانے کے بعد دن کا کھانا تو کھایا نہیں جاتا تھا۔ انگریزوں کے یہاں بھی یہی دستور تھا اور اسے High Tea کہا جاتا تھا۔

شام کو ہم لوگ کلب چلے جاتے۔ جہاں Swimming Pool، ٹینس، بیڈمنٹن اور بلیرڈ وغیرہ کھیلنے کا انتظام تھا۔ ضلع کے سب کلبوں میں اس قسم کی تفریحات مہیا رہتی تھیں۔ ابن کو سوئمنگ اور ٹینس کا شوق تھا۔ وہ ان مشاغل کی طرف چلے جاتے اور میں دوسری خاتون ممبروں سے باتیں وغیرہ کرتی رہتی۔ اس زمانے میں جلد دوست بنالینا بہت آسان تھا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ ٹینس تو میں بھی بہت اچھا کھیلتی تھی۔ یہاں موقع ہے میں بھی ٹینس کھیل سکتی ہوں۔ میں نے ابن سے پوچھا انہوں نے کہا ضرور ضرور کھیلو۔ پانچ سال سے میں نے ٹینس کے بلے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ چنانچہ اب میں نے بڑے انہماک سے ٹینس کھیلنا شروع کیا اور بتدریج میرا بھروسہ اور کھیلنے کا میرا اپنا ڈھنگ واپس آنے لگا۔ تذکرے ہونے لگے کہ مسز رضا ٹینس بہت اچھا کھیلتی ہیں۔ یہ معمول بھی بن گیا کہ ابن مردوں کے ساتھ اور میں دو تین اور خواتین کے ساتھ جن میں 2 انگریز تھیں۔ ٹینس کورٹ کی طرف چل دیتی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ کبھی کبھی Mixed Double بھی کھیلنے لگی۔ چار چھ مہینے گزر گئے۔ لیکن اب یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ کلب سے گھر آتے آتے ابن کا موڈ بدل جاتا وہ چپ چپ سے ہو جاتے۔ گھر پہنچ کر اسد دوڑتا ہوا ہم لوگوں کے پاس آتا۔ ہم پوری توجہ سے اسد میں مبتلا ہو جاتے ابن کی خاموشی بھی دور ہو جاتی۔

پھر کچھ دنوں بعد یہ ہونے لگا کہ ہم لوگ جب سونے جاتے تو یہ مجھ سے الجھ پڑتے کسی چھوٹی سی بات پر۔ دوسرے دن اٹھتے تو گہری خاموشی لیے ہوئے۔ لیکن پھر کچہری کے لیے تیار ہونے اور درمیان میں اسد کی اچھل کود۔ ناشتہ اور کھانا میز پر لگا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مصروفیتوں میں روٹھے رہنے کا وقت نہیں ملتا اور وہ کچہری چلے جاتے۔

شام کو کبھی کبھی اسد کو بھی کلب ساتھ لے جاتے اور اس کی آیا کو بھی۔ کچھ اور مائیں بھی اپنے بچوں کو لے آتیں اور اسد ان بچوں کے ساتھ کلب کے کمپونڈ میں کھیلتا رہتا۔

سیتا پور میں میرے ساتھ اسد کی ایک آیا تھیں جو دراصل مغلانی تھیں۔ لکھنؤ کی معاشرت میں مغلانی کا درجہ مہتمم خانہ کا ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں میجر ڈومو کہا جا سکتا ہے۔ یہ عورتیں بڑی سلیقہ شعار اور گھر داری کے تمام کاموں سے واقف ہوتی ہیں۔ بے حد شستہ زبان بولتیں اور اٹھنے بیٹھنے کی تہذیب و آداب میں رچی بسی مزاج شناس عورتیں ہوتی تھیں۔ وقت کے ساتھ یہ خوبیاں کم ہو رہی تھیں لیکن پھر بھی کئی خوبیاں اب بھی موجود تھیں۔ ہماری مغلانی کچھ زیادہ ہی خوش مزاج اور کھلنڈری تھیں۔ میرے پاس بیٹھنے کا موقع ڈھونڈتی رہتیں۔ ایک دن کہنے لگیں کہ بیگم صاحب آپ کا میٹھا سال لگا ہوگا۔

''میٹھا سال کسے کہتے ہیں'' میں نے پوچھا

اے بیگم یہی اٹھارہواں سال ہوگا آپ کا

میں نے ہنس کر کہا کہ نہیں میری عمر اٹھارہ سال سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارے بیرے خورشید سے ان کی بہت پٹتی تھی۔ اکثر زنانے مکان سے مغلانی کے ٹھٹھوں کی آواز آتی رہتی۔ وہاں

خورشید ضرور ہوتے تھے۔ میرے گھر میں ایک غسل خانہ میں دروازہ نہیں تھا۔ پردہ پڑا رہتا تھا۔ گرمیوں میں میرے شوہر اکثر اس غسل خانے میں نہانے چلے جاتے اور مغلانی بھنک پا کر پردے کے پاس جا کر پوچھتی کہ ''نواب صاحب صابن ہے غسل خانے میں نہیں ہے تو میں لے آؤں''

ابن الجھ کر کہتے ''لاحول ولاقوۃ'' سب ہے یہاں''

غسل خانے سے نکل کر مجھ سے کہتے کہ منع کرو اس مغلانی کو کہ غسل خانے کے پاس نہ آیا کرے اور میں نواب صاحب نہیں ہوں۔ پھر میں مغلانی کو سمجھاتی کہ صاحب خفا ہوتے ہیں تم کیوں جاتی ہو صابن کو پوچھنے بیرا موجود ہے وہ کرے گا یہ کام۔

کھانا میز پر لگتا تو مغلانی اطلاع کرتیں کہ بیگم صاحب خاصہ میز پر لگ گیا ہے۔ یا خاصہ تناول کرنے آ جایئے۔ کھانے کو لکھنوی زبان میں خاصہ کہا جاتا تھا اور کھانا کھایئے کو تناول فرمایئے بولتے تھے۔ زبان کی نرمی اور نزاکت لکھنو کی خصوصیت تھی۔

مجھے گھر بار چلانے میں بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کی پرورش میں بھی دل لگتا تھا۔ اسد کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں بچوں کو پالنے کے بارے میں کتابیں پڑھتی رہتی تھی اور بالکل لکیر کی فقیر بنی ہوئی تھی۔ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں۔ خود کوئی تجربہ نہیں تھا بڑوں کے تجربوں کو ہم لوگ قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کم عمری میں ہم لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی باتیں پرانی ہو چکی ہیں اور نئے مشوروں کو دل و جان سے ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اتنی سمجھ نہیں ہوتی پرانے تجربے آزمائے ہوئے ہیں۔ انہیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، نئے تجربے پرانے ہو کر وہیں آ جاتے ہیں جہاں پرانے تجربے تھے۔ یہ گورکھ دھند جب سمجھ میں آتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

ہمارے دن اچھے گزرنے لگے۔ میں کوئی ڈگری یافتہ نہیں تھی۔ مگر کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے تو ہر قسم کی کتابیں پڑھ ڈالتی تھی۔ انگریزی ناولوں میں جو مل جائے پڑھنے کو بیٹھ جاتی۔ میرے مذاق میں کوئی پختگی نہیں تھی۔ پھر جاسوسی ناولیں پڑھنے لگی۔ فلسفے کی کتابوں کا شوق ہو گیا ایک زمانے میں Hume پڑھا کرتی تھی۔ جس میں بہت کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر تاریخی کتابیں۔ آپ بیتی اور پرائی بیتی۔ جغرافیائی معلومات کی کتابیں سب ہی کچھ پڑھنے میں دل لگنے لگا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میرے شوہر کو میرا کتابیں پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر تجزیہ کیجئے تو بات صرف اتنی ہے کہ ابن اپنی طرف سے مجھے دیوی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ مگر دیوی ایک بت ہوتی ہے۔ اس پر قربان ہو اس کے آگے ڈنڈوت کرو۔ وہ بے حس و حرکت تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ پھر پجاری کبھی کبھی دیوی کو اس کے سنگھاسن سے گرا بھی دیتا ہے۔ اور خوش ہو کر اسے پھر چھتر کی چھاؤں میں بٹھا دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ میرا یہ تجزیہ کلیتاً صحیح نہ ہو۔ لیکن مرد یہ ضرور چاہتا ہے کہ عورت مکمل سپردگی کے ساتھ اس کی ہو جائے اس کی الگ کوئی شخصیت نہ ہو۔ میں نادانستہ طور پر یہ نہ کر سکی۔ میں نے شوہر اور بچوں کی ضروتوں کے آگے اپنی ضرورتوں یا اپنی تفریح کو کبھی ترجیح نہیں دی۔ نہ میری یہ تمنا تھی کہ میں کوئی نمایاں کام کروں، محفل میں چمکوں۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اوسط درجے کے خاندان کی شگفتہ سی عورت تھی کھلے دل کی۔ سسرال میں برسوں مشترکہ خاندان کے ساتھ گھل مل کر رہی ہوں۔ آج بھی سسرال رشتے داروں سے میری قربت بنی ہوئی ہے۔ میرے میاں کو میں بہت اچھی لگتی تھی اور بہت بری لگتی تھی۔ بری اس لیے کہ میرا اپنا ایک وجود تھا جو میرا بنایا ہوا نہیں تھا وہ میری ذات کا جز تھا۔ اسے میں لے کر پیدا ہوئی تھی، اگر میرے شوہر میرے وجود کی انفرادیت کو اس طرح قبول کرتے کہ اس عورت میں کوئی اچھائیاں بھی ہو سکتی ہیں لاو انہیں دیکھیں۔ تو

میری علیحدگی خود گھل کر عباس رضا کی خوبیوں میں جذب ہونے لگتی مگر ابن کی خودی کی ٹھیس جس کو یہ مدت سے پالے ہوئے تھے ناسور بنتی جارہی تھی۔ میرے سسر جہاں دیدہ انسان تھے۔ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اس لڑکی میں جو ہلکی سی چمک ہے اس سے ہم اپنے گھر کی روشنی کو فروغ دیں۔ وہ میرے ساتھ بڑی دلداری اور شفقت سے پیش آتے اور بڑی قدر دانی کا اظہار کرتے۔ اگر وہ کچھ سال اور زندہ رہتے تو ان کے برتاؤ سے ابن اور میری ابتدائی دور کی ازدواجی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں کچھ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی اور میری کہانی یہ نہ ہوتی جو میں لکھ رہی ہوں۔

جب میری نسبت قرار دی جارہی تھی تو میرے والد نے جسٹس رضا سے کہا تھا کہ رضا صاحب میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی چنگاری ہے چنگاری۔ رضا صاحب نے جواب دیا تھا کہ ماجد حسین صاحب کوئی بات نہیں ہے میرا بیٹا بھی انگارہ ہے۔ نہ مجھے معلوم تھا کہ میں چنگاری ہوں اور نہ ابن اپنے کو انگارہ سمجھتے تھے۔ وہ شکار ہو گئے خود اپنی زود حسی کے اور میں ایسی چنگاری نہ تھی جس کی تمازت کو کم نہ کیا جا سکے۔ چنگاری تو بہر حال بجھ جاتی ہے۔

سیتاپور میں مشکل سے ایک سال گزرا ہوگا کہ ان کا تبادلہ بارہ بنکی کا ہو گیا۔ سیتاپور کے قیام میں ہم لوگوں نے لکھنؤ آ کر Opel Caliroolet خرید لی۔ ۲۲۰۰ میں بالکل نئی گاڑی شوروم سے لے کر ہم لوگ سیتاپور پہنچے۔ شوق سے سب کو دکھاتے رہے۔ چلتی ایسی تھی جیسے تیر رہی ہو۔ بڑی سڑکوں اور گڈھوں وغیرہ کو گاڑی کے Shock Absorbers اپنے آپ ہی سنبھلتے بیٹھنے والوں کو پتہ ہی نہ چلتا کہ گاڑی کسی گڈھے پر سے گزر گئی۔ ہڈ گر جاتا تھا۔ گرمیوں میں بہار آ جاتی۔ ہم لوگ لال دو پٹہ ململ کا اڑاتے ہوئے گاڑی میں میلوں کی سیر کرتے۔ غرض کہ بڑی پیاری گاڑی تھی آج خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب ایک دو پہیوں کا Scooter بھی ۲۲۰۰ میں نہیں ملتا۔ بارہ بنکی لکھنؤ سے کل سترہ میل دور تھا۔ ہم لوگوں کا لکھنؤ کا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ ''کاشانہ رضا'' تھا ہی رہنے کے لیے۔ ساتھ ہی بارہ بنکی میں بھی ایک بڑی سی کوٹھی کا آدھا حصہ کرایہ پر مل گیا۔ کوٹھیاں اتنی بڑی بڑی ہوتی تھیں کہ آدھا حصہ آج کل کے بڑے سے بڑے فلیٹ سے بھی بڑا ہوتا تھا۔ غرض کہ بڑے فراغت اور آرام سے رہنے کا انتظام ہو گیا۔ باورچی ایک بیرا اور ایک آیا ہمارے ساتھ تھے۔ اب ماشاءاللہ اسد کا پانچواں سال تھا اور ہم لوگوں کو ان کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک نیا اسکول بچوں کے لیے کھلا تھا۔ یہ St. Mary اسکول چھوٹے بچوں کے لیے تعلیم، تفریح اور بچوں کی صحیح نگہداشت یہ سب مہیا کر رہا تھا۔ رنگ برنگے چھوٹے Desk جھولے Seesaw کام سیکھی ہوئی آیائیں جو بچوں کی دیکھ بھال میں ماہر اچھی خوش مزاج ہنس مکھ ٹیچریں۔ میں نے ہمت کر کے اسد کو اپنی بڑی بہن کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے کام کے لیے ایک معتمد خدمت گار خورشید کو بھی وہیں تعینات کر دیا۔ ایک مشکل ضرور مجھے درپیش تھی کہ اسد کو دو بار Appendicitis کا درد اٹھا تھا۔ علاج ڈاکٹروں کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ بچے کو ساکت وصامت لٹا دیا جائے اور مشروبات پر رکھا جائے۔ یعنی Liquid Diet ایک چار برس کے بچے کو بے حس وحرکت لٹانا اور غریب کو کھانا بھی نہ ملے۔ بڑا ہی صبر آزما ہے۔ مگر اسد بھی عجیب بچہ تھا۔ اسے درد کی تکلیف اتنی تھی کہ وہ خود نہیں ہلتا تھا۔ میں کہوں بھی کہ اسد بیٹے میں کروٹ دلا دوں تو جواب ملتا تھا کہ نہیں بی بی میں ایسے ہی لیٹا رہوں گا۔ پندرہ پندرہ سرہ سترہ دن وہ ایسے ہی لیٹا رہتا۔ ورد کم ہوتا تو کھانے پینے میں احتیاط جاری رہتی۔ غرض کہ ہم سب پر کئی کئی ہفتے بہت فکر مند گزر جاتے۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ شفاالملک حکیم عبدالمعید سے

رجوع کیا جائے۔ ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے ایک گلاس بھر کے کوئی دوا تجویز کی جسے صبح شام پلانا ضروری تھا۔ اسد بغیر منہ بنائے سارا گلاس پی جاتا تھا۔ میرا دل دکھتا تھا لیکن میں ظاہر نہیں کرتی تھی۔ بس شاباشیاں دیا کرتی تھی اپنے بچے کو۔ دوا کافی بدمزہ تھی۔ میں نے اسد کو سمجھایا کہ بیٹے حکیم صاحب کی دوا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ اسد نے میرا منہ دیکھا پھر بولے ''بی بی پھر درد اچھا ہو جائے گا بی بی پھر درد تو نہیں ہوگا'' میں نے گلے لگا کر تسلیاں دیں کہ بیٹے انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا اور درد نہیں ہوگا۔ پھر اسد نے کر دکھایا۔ وہ بغیر منہ بنائے حکیم صاحب کا دیا ہوا پورا قدح پی جاتا۔ یہ صبح شام کا دردتھا۔ یہ قصہ دو سال جاری رہا۔

اسد ختم ہفتہ میں میرے پاس آجاتا اس سے بھی گھر کی شگفتگی قایم رکھنے میں بہت مدد ملتی۔ میرے شوہر پڑھے لکھے تعلیم یافتہ ضرور تھے، مگر گھر کی قدامت پسندی کے تحت ان کی شخصیت ایک نپی تلی شخصیت بن گئی تھی۔ ایک ڈگر پر چلنے اور چلتے رہنے کے عادی تھے۔ ساتھ ہی نہایت حساس۔ صحت کے بارے میں بے حد تو لہ ماشہ کبھی بہت ہی چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر چھ چھ مہینے اپنی ماں سے خفا رہتے۔ ان سے بات نہ کرتے اور تقریباً سارے خاندان سے کنارہ کش ہو جاتے تھے مگر عجیب زمانہ تھا کہ والدین بچوں کو تہذیب تمیز تو سکھاتے اور اس پر بہت زبردست تاکید رہتی کہ ادب آداب میں فرق نہ آنے پائے۔ لیکن اگر لڑکے لڑکیوں میں نفسیاتی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں تو انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا کہ بڑے ہو کر خود ٹھیک ہو جائیں گی یا شادی ہونے پر یہ الجھنیں خود بخود مٹ جائیں گی۔

اس کی طرف سے میری فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ہنوز بارہ بنکی میں تھی۔ ۱۹۳۸ء میں پھر امید سے ہوگئی۔ پیر بھاری ہونے کے زمانے سے بغیر کسی تکلیف کے گزر گئی اور جنوری ۲۴/۱۹۳۹ء میں میرے دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ نام ان کے تایا نے سعید تجویز کیا۔ میں نے خوشی سے منظور کر لیا۔ ابن نے بھی پسند کیا۔ ''کاشانہ رضا'' ختم ہونے کے قریب تھا۔ تھوڑا کام باقی تھا۔ چنانچہ سعید کو St. Mary ہسپتال سے لے کر میں اپنی بہن کے یہاں آگئی۔ یہاں میری والدہ بھی ان کے پاس رہ رہی تھیں۔

☆☆☆

نخلستان کی تلاش، ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''

''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''

کے بعد

رحمٰن عباس

کا

تہلکہ خیز ناول

روحزن

قیمت:- 350/

ملنے کا پتہ:

ممبا بکس انڈیا، ممبئی

0932226262

عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

جو وہ لکھیں گے جواب میں

جناب بیگ احساس صاحب........ آداب!

یوں تو میرے پاس اردو کے سب رسالے آتے ہیں خاص طور پر اردو دنیا، ایوانِ اردو، بیباک، فکر و تحقیق، آجکل وغیرہ لیکن میرے مطالعے میں سب رسالے رہتے ہیں۔ 'سب رس' کا ستمبر کا شمارہ اقبال لائبریری میں دیکھا۔ ویسے تو میں آپ کی کہانیاں مختلف رسائل میں پڑھتی رہی ہوں، لیکن ''دخمہ'' جس پر آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا ہے تین مرتبہ پڑھی جب سمجھ میں آئی تو مبارکباد دینے پر مجبور ہوگئی۔ ویسے آپ کا تذکرہ میرے والد انل اگروال اور سیفی سرونجی صاحب کرتے رہتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے سیمینار کی چند یادگار تصویریں بھی انتساب میں دیکھی تھیں۔ آجکل انتساب کی کمپوزنگ میں ہی کرتی ہوں۔ 'سب رس' کے اس شمارے میں 'دخمہ' پر پروفیسر قدوس جاوید کا مضمون بہت خوب ہے۔ اسے پڑھ کر کہانی کو دوبارا پڑھا تو اس کا لطف دوبالا ہوگیا۔ مبارکباد پیش کرتی ہوں

استوتی اگروال۔ سرونج (مدھیہ پردیش)

محترم بیگ احساس صاحب!

تبسم زہرا کا افسانہ 'آخری منزل' پڑھ کر حیران رہ گئی۔ غالباً یہ نئی افسانہ نگار ہیں اس لیے مصلحتوں سے کام لیے بغیر سب کچھ سچ سچ لکھ دیا۔ ہماری دانش گاہوں میں اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر استاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کا کیا ہوگا؟ استادوں کے درمیان ناجائز تعلقات، اسکالروں کا ترقی پانے کے لیے حدوں کا پار کر لینا۔ سیمناروں کے نام پر اساتذہ کی عیاشی...! جب اساتذہ ہی شاگردوں کا اس طرح استحصال کرنے لگیں تو پھر کسی بھی یونیورسٹی اور فلم انڈسٹری میں کیا فرق رہ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شعبے میں اچھے بُرے لوگ ہوتے ہیں لیکن درس گاہوں میں اس طرح کے واقعات تشویش ناک ہیں۔

منزہ شیخ۔ اورنگ آباد

مکرمی!

سب رس ملا۔ شاعری کے حصے میں نظموں کا پلّہ بھاری ہے۔ ساری نظمیں اچھی ہیں خاص طور پر سلمان حامد کی ''الزائمر'' اور شہباز حسین کی نظمیں ''کمرہ، مجذوب، اور الٹی میٹم متاثر کن ہیں۔ محمد طارق کا افسانہ 'احساس کا قتل' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیا آدمی اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔

ثنا خاں۔ ممبئی

بیگ احساس صاحب!

سب رس نومبر 2018ء کا ٹائٹل دیکھ کر بے ساختہ منہ سے واہ نکلی۔ ٹائٹلس (سرورق) پر آپ خاص توجہ دیتے ہیں۔ کسی کمہار کی گلی کا منظر ہے۔ گھڑوں اور کنڈوں کی قطار، ایک مٹی کی دیوار، پھوس کی چھت اور بیل گاڑی کا پہیہ....!! واہ.... کیا خوب صورت منظر ہے دو خواتین گھڑوں کے پاس بیٹھی ہوئیں ایک خاتون کے ہاتھ میں بکٹ کمر پر ٹھلیا.....!! سب رس اپنے سرورق اور اداریئے کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ آپ کے جمالیاتی احساس اور سیاسی بصیرت کا اعتراف نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ پٹیل کے مجسمے پر آپ نے جو اداریہ تحریر کیا اس سے مجھے سو فی صدی اتفاق ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

آئرہ فاطمہ۔ نئی دہلی

مکرمی ____ تسلیمات!

سب رس نومبر 2018ء نظر نواز ہوا۔ سر سید، مسعود حسین خاں، وحیدالدین سلیم اور انتظار حسین پر مضامین جان دار ہیں۔ مسعود حسین خاں کے خاکہ نما مضمون میں ڈاکٹر اشرف رفیع نے ان کی جو نظم شامل کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی ردیف ہی کچھ نہ ملا ہے۔ کہیں یہ ناشکری تو نہیں۔ مسعود حسین خاں صاحب کو جو عزت و شہرت ملی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائض رہے یہ الگ بات ہے کہ ذاکر حسین صاحب کی بلندی تک نہ پہنچ پائے۔ لیکن تاریخ ادب ان کے نام کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔ پروفیسر اشرف رفیع نے بعض نئے گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔

حسّان علی خاں۔ کاکور، یوپی

پروفیسر بیگ احساس صاحب ____ تسلیمات!

ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی کو مضمون ''نیا زاویۂ انفراد محتاط زاویۂ نگاہ'' پڑھ کر جی خوش ہوا۔ ڈاکٹر نور فاطمہ نے جو مضمون نیا دور میں لکھا ہے وہ ''مینڈکی کے زکام'' کے مترادف ہے۔ نور فاطمہ حیدرآباد کی عظمت اور اردو خدمات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ قلی قطب شاہ جو پہلا صاحب دیوان اردو شاعر ہے سے لے کر میر محبوب علی خاں و میر عثمان علی خاں کی اردو خدمات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اردو کا معمولی سا طالب علم بھی جانتا ہے۔ انھوں نے دکنی زبان کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ ہم یو پی اور بہار کے علاوہ راجستھان کی بولیوں سے بھی واقف ہیں۔ یو پی میں تمام اردو مدارس ختم کر دیئے گئے۔ مسجدوں کے اعلانات اور قبروں کے کتبے تک ہندی میں لکھے جا رہے ہیں۔ ملازمتوں کے مواقع بالکل نہیں ہیں۔ یو پی، بہار کے ایسے دیہاتوں سے یہ لوگ آتے ہیں جہاں بیت الخلا تک میسر نہیں ہیں۔ ایک بار حیدرآباد آجاتے ہیں تو پھر کوئی شہر اچھا نہیں لگتا۔ یہاں کی ساری سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں ایسی عظیم الشان یونیورسٹی قایم کی گئی جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے بھی حیدرآباد کی سرزمین کا انتخاب کیا گیا۔ یہاں ایرپورٹ، ریلوے اسٹیشنس، سرکاری محکموں کے سائن بورڈز پر اردو لکھی جاتی ہے۔ سرکاری ایمبلم میں بھی اردو میں تلنگانہ سرکار لکھا ہے۔ یہ حیدرآباد والوں کی وسیع القلبی ہے کہ اپنی سرزمین میں پر چاہے وہ کوئی یونیورسٹی ہو یا اردو چیانل یا آئی ٹی کمپنیز ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ بی بی ہم نے لکھنو بھی دیکھا ہے۔ وہ لکھنو جس پر داستانوں کے صفحات سیاہ کیے گئے۔ ناول اور افسانے لکھے گئے وہ اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ بہار کا تو کہنا ہی کیا۔ کبھی بہاریوں کی زبان پر آپ نے غور فرمایا؟ بے گھر اور بے خانماں لوگوں کو سہارا دینا حیدرآباد کی پرانی روایت ہے۔ کتنے بہاری ہیں جو یہاں آکر مسجدوں اور مدرسوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اکثر بہاری اور یو پی والے ننگے پیر آئے اور یہاں آکر انھوں نے مدرسے قایم کر لیے اب سکون اور چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بی بی حیدرآباد اردو تہذیب کا آخری جزیرہ ہے۔ اس کے بعد اور جنوب میں جائیے تو اندازہ ہوگا کہ تہذیب اور زبان کی تبدیلی کیا ہوتی ہے۔ ابھی تو آپ نے لکھنا شروع کیا ہے۔ ایسے موضوعات سے گریز کیجئے جو متنازعہ ہوں۔ یہاں کی زمین میں داغؔ، امیرؔ مینائی، فصاحت جنگ جلیلؔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے علاہ کئی شمال کے نامور افراد دفن ہیں۔ ہم سب کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ وہ زمانے لد گئے جب زبان کے نام پر دوسرے علاقے کے لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ ایسی تبدیلی آئی ہے کہ

آپ کی زبان پر تصنع ہو کر رہ گئی۔ اس کے جاننے والے اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے علاقے میں زبان و ادب کی حفاظت کیجئے۔ دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے خود اپنے زوال کا احتساب کیجئے۔

محمد عبدالغنی۔ حیدرآباد

محترم (مدیر) پروفیسر بیگ احساس____ السلام علیکم!

ماہ ستمبر 2018ء حصول ہوا۔ اداریہ پڑھ کر احساس ہوا کہ ہندوستانی سیاست پر آپ کی نظر گہری ہے۔ آپ نے انتخابات 2019ء سے پہلے جس طرح کا سیاسی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ اس میں آغاز سے لے کر اواخر تک ایک ایسی حقیقت اور سچائی بیان کی گئی ہے جس سے آج کی ہندوستانی سیاسی پارٹیاں انکار نہیں کر سکتیں۔ جس طرح اقلیتی طبقے پر بھگوا رنگ سبقت لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ منظر نامہ سب کے سامنے ہے اور ایک بدیہی حقیقت ہے۔ آزادی کے بعد جس طرح اقلیتی طبقہ ڈر اور خوف کے سائے میں جی رہا تھا۔ 2014ء کے بعد یہ خوف اور دہشت مزید بڑھ گئی ہے۔ سرکاری پالیسیاں کچھ اس طرح کی بن چکی ہیں کہ دولت مند مزید دولت مند ہوتا جا رہا ہے۔ غریب اور زیادہ غریب ہوتا جا رہا ہے اور غریبی کی ریکھا میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار ملک کی دولت کو لوٹ کر ہندوستان سے باہر اپنی عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آج تک حکومت نے ان کے خلاف کوئی بھی سخت اقدام نہیں اٹھائے۔ اس اداریے کے لیے سب رس کے مدیر کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اس ماہ نامہ کا پہلا مضمون ہے ''دخمہ تہذیب کے برہنہ نعش اور گدھ'' جس کا پروفیسر قدوس جاوید نے بڑی چابکدستی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ دخمہ پر اس تجزیہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مصنف نے نہ صرف دخمہ پر تجزیہ کیا ہے بلکہ شروع سے تحریک افسانے کی روایت پر ان کی نظر گہری ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب کیوں بکھرتی چلی گئی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ کس طرح یہ تہذیب مختلف علاقائی تہذیبوں کے ساتھ مل کر اپنی Purity کو قایم نہیں رکھ سکی، اس طرف معنی خیز اشارے کیے گئے ہیں۔ اقلیتی طبقہ جس نے ہندوستان کی آزادی کو خون سے سینچا اس کے باوجود آج ایک لمبی مدت گزر جانے کے بعد بھی اس طبقے کو پاکستانی اور غدار کہا جاتا ہے۔ آج بھی اکثریت ہندوستانی ماننے کو تیار نہیں اور جواز یہ دیا جاتا ہے کہ تم ہندوستان میں آئے ہوئے باہر سے بسنے والے لوگ ہو۔ اس طبقے کی تمام وفاداریاں بھول کر اس کو بس ایک لفظ ''دہشت گرد'' سے پکارا جاتا ہے۔ مصنف کی نظر مغربی ادب پر بھی گہری ہے، اور انہوں نے اردو افسانے کو مغربی تصورات میں پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بیگ احساس کے ساتھ جن دوسرے افسانہ نگاروں نے قدم بڑھایا۔ اس طرف بھی ضروری اشارے کیے گئے ہیں۔ قدوس جاوید کو نہایت عمیق اور گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرنے پر دلی مبارک باد۔ فیاض رفعت کا مضمون ''حمید سہروردی سفر مدام کا افسانہ نگار'' مختصر مگر اچھا مضمون ہے۔ مصنف نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

عمران عاکف خان کا مضمون ''اسرار گاندھی کے افسانوں کا استعاراتی نظام'' بھی نظر سے گزرا۔ حوالوں کے ذریعہ عمران عاکف نے استعاراتی نظام پر ایک اچھی گفتگو کا اظہار کیا ہے۔ امید ہے ان کے اس مضمون کے سامنے آنے کے بعد استعاراتی نظام کی یہ بحث اور آگے بڑھے گی۔

ڈاکٹر وسیم بیگم (مانو، حیدرآباد)

ساھتیہ اکادمی ادبی ایوڈرز 2018 کا اعلان

اردو میں 2018 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 'روحزن' کے لیے رحمٰن عباس کو

ہندی میں چترا مُدگل، کشمیری میں مشتاق احمد مشتاق اور انگریزی میں انیس سلیم کو ایوارڈ

اردو زبان میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2018 معروف ناول نگار رحمٰن عباس کو ان کے ناول 'روحزن' کے لیے دیا جائے گا۔ 'روحزن' رحمٰن عباس کا چوتھا ناول ہے۔ یہ ناول ممبئی کی ہمہ جہت زندگی کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی میں محبت کی معنویت اور سنجیدگی کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنے کی سعی ہے۔ اس ناول کا انگریزی، ہندی کے علاوہ جرمن زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ رحمٰن عباس کی اب تک سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں چار ناول 'نخلستان کی تلاش'، 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'، 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' اور 'روحزن' شامل ہیں۔

آج نئی دہلی میں ساہتیہ اکادمی ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ چیئرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں آج رویندر بھون میں اکادمی کی ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ میں 24 ہندستانی زبانوں کے لیے ساہتیہ اکادمی کے اعلیٰ ادبی ایوارڈز 2018 کو منظوری دی گئی۔ اس سال سات شعری مجموعے، چھ ناول، چھ افسانوی مجموعے، تین ادبی تنقید اور دو مضامین کے مجموعے کو انعامات کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ایوارڈ یافتگان میں چترا مُدگل (ہندی)، مشتاق احمد مشتاق (کشمیری)، انیس سلیم (انگریزی)، بینا ٹھاکر (میتھلی) کے نام شامل ہیں۔

اردو ایوارڈ کا فیصلہ جیوری کی میٹنگ میں ہوا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینز اور معروف شاعر شین کاف نظام نے کی اور جیوری ممبران میں پروفیسر بیگ احساس، جناب جینت پرمار اور جناب نصرت ظہیر احمد شامل تھے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے جو 29 جنوری 2019 کو نئی دہلی میں منعقد ہونے والی ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ اس بار یکم جنوری 2012 سے 31 دسمبر 2016 کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی نمائندہ کتابیں زیر غور آئیں۔

جن ادیبوں اور شاعروں کو اکادمی ایوارڈ سے نوازے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے ان کے نام ہیں: سنتا تانتی (آسامی)، سنجیب چٹو پادھیائے (بنگالی)، ریتوراج بسوماتاری (بوڈو)، اندرجیت کیسر (ڈوگری)، انیس سلیم (انگریزی)، شریفہ وجلی والا (گجراتی)، چترا مدگل (ہندی)، کے جی ناگاراجپّا (کنڑ)، مشتاق احمد مشتاق (کشمیری)، پریش نریندر کامت (کونکنی)، بینا ٹھاکر (میتھلی)، ایس رمیش نائر (ملیالم)، بودھی چندرا ہئیس نمبا (منی پوری)، ماسو پاٹل (مراٹھی)، لوک ناتھ اُپادھیائے چاپا گائیں (نیپالی)، دسرتھی داس (اڑیہ)، موہن جیت (پنجابی)، راجیس کمار ویاس (راجستھانی)، راما کانت شکل (سنسکرت)، شیام بیسرا (سنتھالی)، خرمن یوملانی (سندھی)، ایس راما کرشنن (تامل)، کولا کالوری انوک (تیلگو) اور رحمٰن عباس (اردو)۔

اس کے علاوہ اکادمی کی ایگزیکیٹو بورڈ نے سات بھاشا سمان کی بھی منظوری دی جو امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ قرون وسطیٰ کی زبانوں میں نمایاں ادبی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔

گلزار جاوید
Editor "Chahar Su"
537/D-1,Street No. 18, Westerage-III,Rawalpindi
46000 - Pakistan

عارف خورشید
Baitul Ankaboot, P.No.7, Opp: Mastan Function
Hall ,Manju Hills, Rasheedpura,
Aurangabad - 431 001

مشتاق احمد وانی
Asst. Prof. Dept of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri

نورالحسنین
1-12-31, Pragati Colony, Ghati,
Aurangabad 431 001

فیروز عالم
Assistant Professor, ACSSEIP
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032.

شمس کمال انجم
Head Dept of Arabic/Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University, Rajouri

گلشن آرا
Research Scholar, Dept of Urdu,
B.R.A. Bihar University, Muzaffarpur

عبدالحلیم انصاری
C/o-Haji Zainul Abedin
F.H.S Road Near Laal Masjid
PO+PS Raniganj-713347

مصطفیٰ شہاب
28, Weighton Road, Harrow, Middlesex,
HA3 6HZ - U.K.

عابد علی عابد
10, Gulistan Colony, Badam Nagar, Aligarh,
Uttar Pradesh - 202 002

مسعود جعفری
8-1-43/1/A/5, P.O. Shaikpet, Hyd - 500 008

بی ایس جین جوہر
Portapur, Delhi Road, Meerut - 250 103

بدر محمدی
Chandpur Fateh, Bariarpur
Dist: Vishali Bihar - 843 102

رفیق جعفر
Ranjeet Singh Colony, Opp: Talan, Nalband Galli,
Talegaon Dabade, Taluka Maval, Pune 410 506

مصداق اعظمی
Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh,
Uttar Pradesh - 276 304

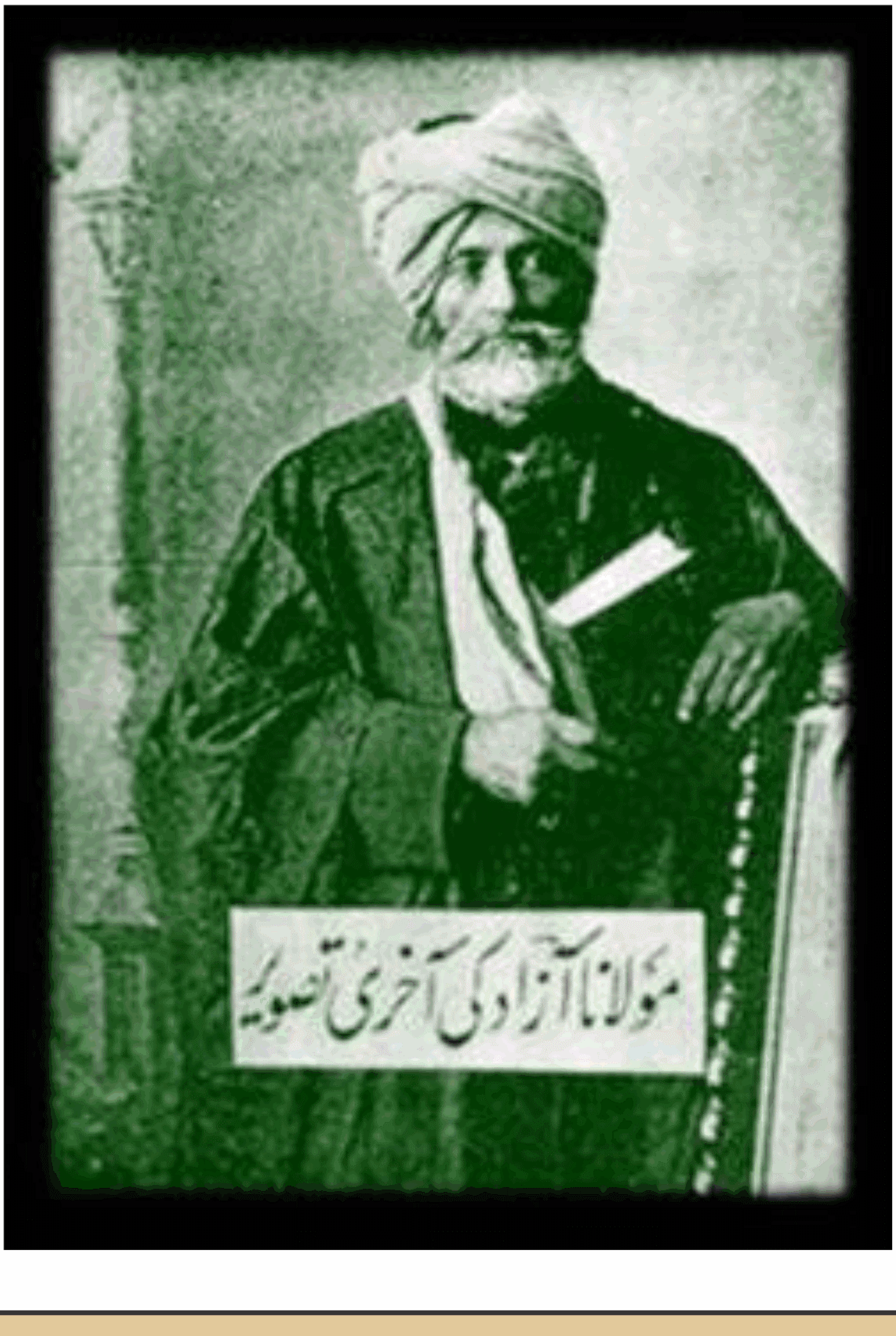

مولانا آزاد کی آخری تصویر

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-12 December, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469